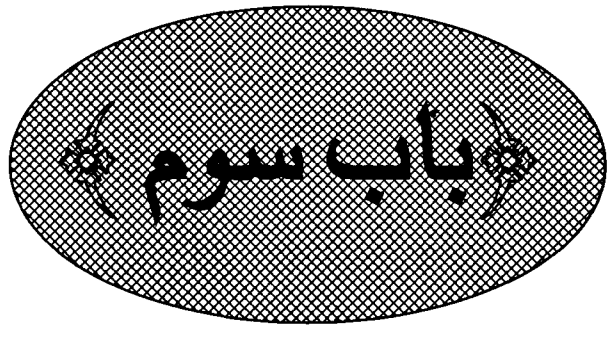

باب سوم

اقبالؔ کے معروف شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ایک جائزہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو نہ صرف اقبالؔ کا ایک معروف شارح ہونے کی حیثیت حاصل ہے بلکہ اگر اُنہیں علاّمہ اقبالؔ کے ایک باوقار شارح سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ چشتی صاحب نے علاّمہ اقبالؔ کے کلام کی شرحیں لکھنے کے علاوہ ان پر مسبوط کتابیں اور مضامین بھی لکھے ہیں۔

پروفیسر چشتی کو مستثنیٰ کر کے دیگر تمام شارحینِ اقبالؔ نے علاّمہ اقبالؔ کے شعری مجموعوں کی جستہ جستہ شرح لکھی ہے۔ لیکن پروفیسر چشتی کو اِس ضمن میں ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے علاّمہ اقبالؔ کے تمام شعری مجموعوں 'بانگِ درا، بالِ جبرئل، ضربِ کلیم، پیامِ مشرق، ارمغانِ حجاز، جاوید نامہ، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد اے مسافر' کی شروح لکھی ہیں۔

اردو زبان و ادب نے لاتعداد شعرا پیدا کئے ہیں لیکن صرف مرزا غالبؔ اور علاّمہ اقبالؔ کے کلام ہی کی شرحیں لکھنے کی وقتاً فوقتاً امتزاج محسوس کئی گئی، کیونکہ یہ دونوں ایسی شخصیتیں گزری ہیں جن کے افکار و خیالات میں تنوع اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ جہاں تک علاّمہ اقبالؔ کا تعلق ہے، تخلیقِ شعر کے وقت اُن پر ایک روحانی اور

لطیف کرب کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اِس کا اندازہ اُن کے بعض ذاتی بیانات سے لگایا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر اُن کا یہ بیان مُلاحظہ کیجئے:

> ''جب مُجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مُجھ پر بنے بنائے، ڈھلے ڈھلائے شعر اُترنے لگتے ہیں اور میں اُنھیں نقل کر لیتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں نے اِن اشعار میں کوئی ترمیم کرنا چاہی، لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جوں کا توں برقرار رکھا۔''[1]

رمز و ایماء کو اقبالؔ کے یہاں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ظاہر ہے جو شاعر تخلیقِ شعر کے دوران جگر کاوی اور جانکاہی سے کام لے اور شاعر کو وارثِ پیغمبری قرار دے بھلا اُن کے خلاقِ ذہن سے نکلا ہوا شعر اُس گہر آبدار کی مانند کیوں نہ ہو جسے تراشنے میں فنکار کا خونِ جگر شامل رہا ہو۔

---

[1] عبدالمجید سالک ذکرِ اقبال۔ ص۔ 245

علّامہ اقبالؔ جیسے عظیم فنکار کی شاعری کو سمجھنے اور اُسے ذہن نشین کرانے کے لئے ایک ایسے قابل اور کارآزمودہ شارح کی ضرورت تھی جو صحیح معنوں میں شارحِ اقبالؔ کہلانے کا مستحق ہو۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی علّامہ اقبالؔ کے ایک ایسے سنجیدہ طالبِ علم رہے ہیں جنھوں نے کلامِ اقبالؔ کا نہایت غور و فکر کے ساتھ اور بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے۔ اور اُسی مطالعے کی بدولت اُنھیں اقبالؔ کی شخصیت سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ کلامِ اقبالؔ کے مطالعے کے دوران اُنھیں جب کبھی کسی اِستفسار کی ضرورت پڑتی یا اقبالؔ کی رہنمائی مطلوب ہوتی تو اقبالؔ سے رُجوع کرتے اور اُن سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ چنانچہ کلامِ اقبالؔ کو قابلِ فہم بنانے میں جہاں پروفیسر چشتی نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے وہاں اقبالؔ کی صحبتوں اور اُن سے اِستفادے نے بھی ایک اہم رول ادا کیا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی علّامہ اقبالؔ سے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اِن ملاقاتوں کے دوران پروفیسر چشتی صاحب علّامہ اقبالؔ سے متعدد

مسائل اور موضوعات پر گفتگو کر کے ارشاداتِ اقبالؔ کو ایک نوٹ بُک میں محفوظ کرتے رہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو اُس زمانے میں علّامہ اقبالؔ سے ملاقاتوں کے زیادہ مواقعے میسر ہوئے جب علّامہ اقبالؔ انجمنِ حمایتِ اسلام کے صدر تھے، اور پروفیسر چشتی انجمن کے قائم کردہ اشاعتِ اسلام کالج کے پرنسپل تھے۔

علّامہ اقبالؔ نے شاعری کی خاطر شاعری نہیں کی بلکہ اپنی شاعری میں عہدِ حاضر کے انسان کے مسائل کو حل کرنے کے لئے مختلف تصورات بھی پیش کئے ہیں۔ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مفکر بھی ہیں۔ اُن کا شمار دُنیا کے اُن عظیم شعرا میں ہوتا ہے جن کے یہاں شاعری اور فلسفے کا نہایت حسین امتزاج ملتا ہے۔ اقبالؔ کا پیغام آفاقی ہے۔ اُن پر لکھنے کا آغاز اُن کی حیات میں ہی ہوا تھا۔ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔

شعر کی عظمت کا راز اُس کی کثیر الجہتی میں ہے۔ اقبالؔ کی ہمہ گیریت ان کی شاعری کی حیات سے عبارت ہے۔ لہٰذا اُن کی ہمہ پہلو شاعری کا شرح کے ساتھ معانی کے تناظر میں احاطہ کرنا کارے

دار والا معاملہ ہے۔ شعر و شاعری سے شفقت رکھنے والے شرح کا مطالعہ اِس مقصد کے تحت کرتے ہیں کہ بغیر کسی اُستاد کی رہنمائی کے شعر کے مفہوم کو ذہن نشین کر سکیں۔ چنانچہ شرح جیسے مشکل کام کو پورا کرتے وقت شارح پر جو بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، پروفیسر چشتی صاحب نے اُس ذمہ داری کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے۔ اُن کی شرحیں علّامہ اقبالؔ کی شخصیت اور اُن کے تخلیقی شعور کو بہت حد تک واضح کرتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اُن کی شرحوں نے علّامہ اقبالؔ کی روز افزوں مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُن شرحوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر فہمی کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہیں۔ کسی بھی نظم یا غزل کی شرح سے پہلے اُس کے بنیادی تصور یا مرکزی خیال کی طرف اُن کی نگاہ جاتی ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب اقبالؔ کے اشعار میں پیش کئے گئے واقعات کا بیان بڑی خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

اِس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

یعنی کارل مارکس کی تعلیمات سے مشرق ومغرب میں قیامت برپا ہے۔ اُس کی تعلیم نے مزدوروں اور فاقہ کش طبقہ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اُن کی طبیعت میں فساد پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنے ماحول اور حالات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ ہم صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اِس لئے غلاموں نے اپنے آقاؤں کو حکومت سے محروم کر دیا اور خود اُن کی جگہ قبضہ کر کے حکمراں ہو گئے۔

شعر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے چشتی صاحب لکھتے ہیں:۔

''اِس شعر میں اُس عظیم الشان انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۱۷ء میں روس میں رونما ہوا، جبکہ مزدوروں نے زارِ روس کو، جو اپنے وقت کا فرعون تھا، پہلے تاج وتخت سے محروم کر کے ترکستان میں جلا وطن کیا پھر اُس کو اور اُس کے تمام افراد اور خاندان کے لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔'' [1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ص ۔ 34

شعر کی تشریح کے آغاز میں رقمِ طراز ہیں:۔

''کارل مارکس (Karl Marx) یہودی الاصل تھا اور جرمنی کا باشندہ تھا۔ انقلابی اشتراکیت (Socialism) کا بانی تھا۔ حکومت نے جلاوطن کر دیا تو فرانس میں آیا۔ فرانس سے نکالا گیا تو لندن آیا اور تادمِ وفات تک یہیں مقیم تھا۔ اِس کتاب کی سرمایہ اشتراکیوں کی نظر میں بائبل (Bible) سے کم نہیں ہے۔''[1]

پروفیسر چشتی صاحب نے کلامِ اقبالؔ کی شرح لکھنے کے دوران کہیں طوالت اور کہیں اختصار سے کام لیا ہے۔ بعض مقامات پر یہ طوالت غیر ضروری صورت اختیار کر گئی ہے، جبکہ کہیں کہیں اختصار کی یہ صورت قاری کو تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ اِس کی مثال بانگِ درا کی نظم 'ترانۂ ہندی' کی شرح سے پیش کی جاسکتی ہے، جس میں پروفیسر یوسف شعر کی تشریح کرنے کے بجائے معلوماتِ بہم پہنچا رہے ہیں:۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ص ۔ 34

''یہ ترانہ اقبالؔ نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا اور ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کو کانپور اُتر پردیش کے مشہور اُردو رسالہ 'زمانہ' کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم کو اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔
اُس میں آخری مصرعہ یوں لکھا تھا:

معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا!

لیکن بعد میں انھوں نے (منشی دیا نرائن نگم) نے اِس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے یوں کر دیا:

معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا!

اِس میں شک نہیں کہ لفظ 'کسی' نے مصرع میں سوز و گداز کی کیفیت میں اضافہ کر دیا ہے۔''[1]

تاہم اِس بات سے انکار کی کوئی گُنجائش نہیں کہ پروفیسر چشتی صاحب کی شرحیں علّامہ اقبالؔ کی فکر کے ساتھ ساتھ اُن کے پیغام کی بھی ترجمانی کرتی ہیں۔
علّامہ اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف میں سے صرف دو کتابوں

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بانگِ درا مع شرح ۔ ص ۔ 203

پر دیباچہ لکھا ہے، ایک 'اسرارِ خودی' اور دوسری 'پیامِ مشرق'۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہی دو کتابیں اُن کی نظر میں اِس لائق تھیں کہ خود ناظرین کو اِن سے متعارف کریں۔

پیامِ مشرق جن اسباب کی بناء پر لکھی گئی وہ تمام لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ اِس لئے خود مصنف کو وضاحت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اِس کتاب کا دیباچہ بہت پُر مغز، پُر از معلومات اور بصیرت افروز ہے۔ اقبالؔ نے یہ کتاب مشہور جرمن حکیم گوئٹے کی غیر فانی تصنیف 'مغربی دیوان' کے جواب میں لکھی ہے جس کی نسبت ہائنا لکھتا ہے کہ 'یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔' پیامِ مشرق میں علّامہ اقبالؔ نے مشرق اور مغرب دونوں کو عشق کا پیغام دیا ہے۔

دلِ من روشن از سوزِ درون است
جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است

یعنی عشقِ حقیقی کی بدولت میرا دل منور ہو گیا ہے۔ اور دل کے منور ہو جانے کی وجہ سے میری نگاہ اِس کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو گئی ہے۔ یعنی عشق وہ طاقت ہے جس کی بدولت انسان کائنات کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔ اور کائنات کی حقیقت اِس کے سِوا کچھ نہیں ہے کہ وہ مظہر ہے اسماء وصفاتِ الٰہیہ کا۔ ہر شے میں اُس کی تجلی ہو رہی ہے۔ اگر اُس کی تخلیقات کا سلسلہ ایک لمحہ کے لئے بھی منقطع ہو جائے تو یہ کائنات معاً نیست و نابود ہو جائے۔ کیونکہ اُس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے، بلکہ مستعار ہے۔

اِس لئے جو شخص عشق کی اہمیت سے منکر ہے، یا جو شخص عشق کو محض جنون سمجھتا ہے، وہ زندگی کی حقیقت سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔

اِس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب اقبالؔ کے اشعار کی تشریح میں تفصیل سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ فارسی کلام کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے پروفیسر صاحب اِس طرح سے تشریح لکھتے ہیں کی قاری کو اِس کے معانی سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن بعض اوقات وہ قاری کو اُلجھا بھی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر

'پیامِ مشرق' کی ہی ایک اور نظم 'کشمیر' جو کہ چھ اشعار پر مشتمل ہے، پروفیسر چشتی پہلے چار اشعار کی تشریح صرف ایک جملے میں یہ کہہ کر کر دیتے ہیں کہ 'اِن اشعار میں کشمیر کی وادیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔' پانچویں شعر میں ناظرین کو موسیقی اور مے نوشی کی ترغیب دی ہے۔ آخری شعر میں کشمیر جنتِ بے نظیر کی سب سے بڑی دلکشی یعنی دُخترِ برہمن کا ذکر کیا ہے۔ اور صرف دو لفظوں میں اِس کا سراپا بیان کر دیا ہے۔

دُخترِ کے برہمنے لالہ رُخے سمن برے
چشمِ بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

پروفیسر چشتی نے پیامِ مشرق میں شرح سے تمہید[1] لکھی ہے۔ اُس کے بعد ہر نظم کا مطلب بیان کر دیتے ہیں۔ 'غنی کاشمیری' کے عنوان سے جو نظم پیامِ مشرق میں سات اشعار پر مشتمل ہے، اُس کا پروفیسر چشتی نے خلاصہ پیش کیا ہے۔ لیکن تمہید میں غنی کاشمیری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

---

[1] پروفیسر صاحب نے ہر نظم کی تمہید میں نظم کے بنیادی تصور پر تبصرہ کیا ہے۔ جو نظم کے مطالب کو بڑی حد تک واضح کرنے میں قاری کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے۔

'مرزا صائبؔ غنیؔ کاشمیری کا بہت قدر دان تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ کاش غنیؔ میرا دیوان مجھ سے لے لیتا اور اپنا یہ شعر مجھے دے دیتا۔ ؎

حسنِ سبزے بخطِ سبز مرا کردہ اسیر
عام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدم

پروفیسر چشتی نظم کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"غنیؔ کاشمیری کا یہ دستور تھا کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو گھر کا دروازہ بند رکھتا تھا اور جب گھر سے باہر جاتا تھا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اُس سے دریافت کیا کہ اس عجیب و غریب طرزِ عمل کی کیا وجہ ہے؟ اُس نے جواب دیا:

میں جو کچھ کرتا ہوں بالکل درست ہے۔ اِس مکان میں میرے علاوہ اور قیمتی شے کونسی ہے؟ اِس لئے جب گھر میں ہوتا ہوں تو 'متاعِ گراں' کی حفاظت کرتا ہوں۔ اور جب میں گھر سے باہر چلا جاتا ہوں تو پھر گھر میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جس کی حفاظت کی جائے؟" [1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 412

جیسا کہ پہلے ہی مذکور ہو چکا ہے کہ پروفیسر چشتی نے ہر نظم کی شرح سے پہلے اُس کے بُنیادی تصور کو واضح کیا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر صرف شعر کے ذریعے سے اُس کے بُنیادی تصور کو واضح کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ رُباعی:

مگو از تدعاے زندگانی
ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوقِ سفر آن گونہ مست
کہ منزل پیش من جز سنگِ رہ نیست

اِس کی تمہید میں یہ شعر:

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

رُباعی:

میا را بزمِ ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط دبا موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اِس رُباعی کی شرح بیان کرتے ہوئے اِس کے معانی کو دوسرے طریق سے یوں سمجھایا ہے:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اِس سے قطع نظر اگر پروفیسر صاحب کی شرح 'بالِ جبرئل' کا مطالعہ کریں تو وہاں بھی اکثر مقامات پر طویل بحثیں چھیڑ کر قاری کو اُلجھا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر بالِ جبرئل کی پہلی ہی غزل کے مطلع

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں!
غلغلہ ہائے الأماں بتکدۂ صفات میں!

کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غور سے دیکھو تو پوری غزل وحدۃ الوجود کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پہلے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا

کے عشق میں گرفتار ہے اور اُس کے فراق میں 'نوائے شوق' پر مجبور ہے۔(۱) عشق میں کیوں گرفتار ہے؟ اس لئے کہ 'کند ہم جنس با ہم جنس پرواز' والا معاملہ ہے۔ انسان کا خدا سے عشق کرنا اِس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی اصل 'خاکی' نہیں ہے۔ اقبالؔ نے اِس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

تر ا جو ہر ہے نو ری پا ک ہے تو
فر و غِ د یدۂ ا فلا ک ہے تو

(۲) 'نوائے شوق' اِس بات کی دلیل ہے کہ عاشق کو یہ صحبتِ آب و گل پسند نہیں آتی۔ اِس لئے وہ محبوبِ حقیقی کی ملاقات کا آرزومند ہے اور یہ بالکل فطری امر ہے:

﴿کُلُّ شَیءٍ یَرجِعُ اِلَّا اَصلِہٖ﴾

ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ مرشد رومیؒ نے اِس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:۔

ہر کسے کہ دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگارِ وصل خویش

ہر شخص جو اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے، وہ اپنی
اصل سے ملاقات کا آرزومند رہتا ہے بلکہ ملاقات
کے لئے کوشاں رہتا ہے۔''[1]

لیکن اُسی غزل کے دوسرے شعر کی تشریح بالکل اختصار کے ساتھ کرتے ہیں:

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخلیات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

یعنی جو شخص 'جمالِ ذات' پر عاشق ہوتا ہے، حور و فرشتہ اُس کی نگاہ میں نہیں جچتے بلکہ اُس کی نگاہ اِس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ تجلیاتِ الٰہیہ میں خلل واقع ہو جاتی ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب نے بالِ جبرئل کے شرح میں بھی حسبِ روایت پہلے مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں بالِ جبرئل کی ترتیب اور خصوصیات بیان کی ہیں۔ اُس کے بعد بالِ جبرئل کے عنوان کی تفصیلاً وضاحت کی ہے۔ اور راجہ بھرتری ہری کی شخصیت کا وہ پہلو ہمارے سامنے لایا ہے جسے غالباً باقی شارحین نے نہیں چھوا ہے۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بالِ جبرئل مع شرح۔ ص ۔ 80

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازُک بے اثر!

یہ شعر راجہ بھرتری ہری کی تصنیف کے پہلے حصہ موسومہ نیتی اشتک کے چھٹے اشلوک سے ماخوذ و اقتباس ہے۔ پورا اشلوک اس طرح ہے:۔

''کسی شخص کا اپنے عقلی استدلال کے زور سے کسی مورکھ کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا ایسا ہی بے سود ہے جیسا کسی شخص کا مست ہاتھی کو کنول کے ڈنٹھل سے روکنا یا شرش کے نازک ریشوں سے ہیرے میں چھید کرنا۔'' [1]

اقبالؔ نے اسی اشلوک کے پردہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اگرچہ بالِ جبرئل میں ایک سے بڑھ کر ایک نکتے بیان کئے گئے ہیں لیکن جو لوگ عقل و فہم سے عاری ہیں، اُن کو اِس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بالِ جبرئل مع شرح۔ص۔ 45

راجہ بھرتری ہری کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"راجہ بھرتری ہری قدیم زمانہ میں مالوہ کا حکمران گذرا ہے۔
اُس کی زندگی کا ابتدائی حصہ بہت عیش و عشرت میں بسر ہوا۔
لیکن آخر عُمر میں اُس نے ویراگ (ترکِ دُنیا) اختیار کرلیا
تھا اور مشہور جوگی گورکھ ناتھ کی خدمت میں رہ
کر ویراگ کی تکمیل کی تھی۔ اُسی زمانے میں اُس
نے اپنی غیر فانی کتاب 'شتک ترمیم' تصنیف کی۔
پہلے حصے کا نام 'نیتی شتک' ہے اور دوسرے کا نام
'شرنگار شتک' اور تیسرے کا 'ویراگ شتک' ہے۔" [1]

یہاں اِس کتاب کی عظمت کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ علّامہ اقبال نے اِس سے استفادہ کیا ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اِس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ شعر قاری کے ذہن نشین ہو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کی یہ بھی کوشش رہتی ہے کہ قاری کے ذہن پر اِس کے گہرے نقوش قائم

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بال جبرئیل مع شرح ۔ص۔ 45

ہوں۔ اِس لئے پروفیسر چشتی نے بعض اوقات تفصیل سے کام لیا ہے۔کلامِ اقبالؔ کی شرحوں میں پروفیسر چشتی نے اپنی استعداد اور فہم وفراست کو زیادہ تر بروئے کار لایا ہے اور حسبِ ضرورت اقبالؔ سے بھی مدد حاصل کی ہے۔ پروفیسر چشتی اکثر تشریح کرتے ہوئے دوسرے شعراء کے کلام کو بھی شامل کر دیتے ہیں تا کہ قاری کو اُس شعر کا مفہوم سمجھنے میں اور بھی آسانی ہو۔مثال کے طور پر بالِ جبرئل کی غزل کا یہ شعر:

یہ بتانِ عصرِ حاظر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

کہتے ہیں کہ میری قوم کے نوجوان، جو کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں، کی حالت پر مجھے سخت افسوس آتا ہے کہ کالج میں جا کر اُن کی زندگیاں بالکل بُرباد ہو گئیں۔ الحاد پرور تعلیم پا کر دینِ اسلام سے بے گانہ ہو گئے۔ دوسری طرف کُفّار کی نگاہوں میں بھی وقعت حاصل نہ کر سکے۔ دین کی نعمت سے محروم ہوئے تھے تو کُفر ہی میں کوئی مقام حاصل کر لیتے، لیکن اُن کی حالت یہ ہے کہ نہ اُن میں

ادائے کافرانہ پائی جاتی ہے نہ تراشِ آذرانہ نظر آتی ہے۔

نہ خدا ہی ملا ، نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے!

اِس مضمون کو اکبرالہ آبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں بیاں کیا ہے۔

دیکھ اے قوم سنتے تھے جسے
چند لڑکے تھے مشن اسکول کے
راہِ مغرب میں یہ لڑ کے لٹ گئے
واں نہ پہونچے اور ہم سے چھُٹ گئے!

اِسی طرح کی اور بھی مثالیں بالِ جبرئل کی شرح میں جگہ جگہ پڑھنے کو ملتی ہیں۔

علّامہ اقبالؔ نے اُردو شاعری میں اپنے کلام کی بدولت ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ آج کوئی شاعر ایسا نہیں جو کسی نہ کسی رنگ میں اُن کے اندازِ بیاں سے متاثر نہ ہوا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ جس طرح میرؔ کا انداز بہت کم شعراء کو نصیب ہوسکا، اُسی طرح اقبالؔ کے رنگ کی کامیاب پیروی بھی بہت کم شعراء کے حصّے میں آسکی۔

علّامہ اقبالؔ کی شہرت کا سنگِ بنیاد اُن کی مشہور کتاب 'بانگِ درا' ہے۔ اقبالؔ کی غزلوں اور نظموں کا یہ دلکش مجموعہ جب شائع ہوا تو لوگوں نے اِس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اِس کی بدولت اقبالؔ کا نام ہندوستان کے طول و عرض میں مشہور ہو گیا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی بانگِ درا کی شاعرانہ خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اِس کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت بآسانی واضح ہو سکتی ہے کہ بانگِ درا تمام نقّادانِ فن کی نظر میں اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ مثلاً ہندوستان کے نامور ادیب اور نقاد پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں: 'اُردو زبان کی جو خدمت اقبالؔ کی شاعری انجام دیتی ہے وہ نہایت مہتم بالشان ہے۔ میرؔ اور غالبؔ کو چھوڑ کر اُردو میں سوائے اقبالؔ کے کوئی ایسا شاعر نہیں ملے گا جس نے زبان پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو۔ انھوں نے اُردو میں جتنے نئے اور خوبصورت الفاظ داخل کیے، جتنی ادبی ترکیبیں وضع کیں اور نفیس تشبیہوں اور استعاروں کا جس طرح وافر ذخیرہ فراہم کر دیا، اُس کی تفصیل کی اِس اجمال میں گُنجائش نہیں ہے۔

شرحِ بالِ جبرئل کی طرح بانگِ درا کی شرح میں بھی پروفیسر چشتی صاحب اُس میں شامل منظومات پر تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن سے قاری کسی بھی نظم کے سبھی اہم پہلوؤں سے واقف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بانگِ درا کی ایک طویل نظم 'شمع اور شاعر' پر پروفیسر صاحب تبصرہ کرتے ہوئے رقمِ طراز ہیں:۔

> ''یہ نظم بانگِ درا کی اُن اہم نظموں میں سے ہے، جن کا جواب جدید اُردو ادب میں نہیں مل سکتا۔ بعض نقاد اِس نظم کو بانگِ درا کی بہترین نظم قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے سب لوگ اِس خیال سے اتفاق نہ کر سکیں لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ اگر بانگِ درا میں سے بہترین تین نظمیں منتخب کی جائیں تو یہ نظم اُس انتخاب میں ضرور شامل ہوگی۔'' [1]

پروفیسر چشتی صاحب اِس نظم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اِس میں پوشیدہ خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بانگِ درا مع شرح۔ ص۔ 501

''اول سے آخر تک بندش بہت چست ہے شوکت
الفاظ اور زورِ بیان کی صفت تحسین سے بالاتر ہے،
ہر مصرع شاعری کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔
آرزو کا شائبہ نظر نہیں آیا۔ پروفیسر سروری نے بالکل
سچ لکھا ہے کہ یہ نظم بانگِ درا کا دل ہے۔'' [1]

اِس کے بعد نظم 'شمع اور شاعر' کا تجزیہ پیش کیا ہے جس میں ہر بند کا مختصر طور پر جائزہ پیش کرتے ہوئے اُس کی شرح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی اقبال کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی شرح کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ جس سے اُس نظم یا شعر کی پوری حقیقت ہمارے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے۔

اِس سے قطع نظر اگر نظم 'ابر' کا مطالعہ کریں تو وہاں پروفیسر چشتی صاحب الفاظ کے معانی درج کرنے کے بعد مختصر طور خلاصہ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً :۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بانگِ درا مع شرح۔ ص ۔ 502

''گلاب کے پھولوں پر سفید بوندیں ایسی معلوم
ہوتی ہیں جیسے سُرخ قبا میں موتی ٹکے ہوئے ہیں۔
ہوا کے زور سے اُبھرا۔ اِس مصرع میں اقبالؔ نے
گھٹا کے اُٹھنے اور گھِر آنے اور پھر برسنے کی تصویر
کھینچ دی ہے۔ کہسار کے نہال یعنی کوہستانی درخت۔'' [1]

اِس نظم کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:۔

''اقبالؔ ۱۹۰۴ء بغرضِ تفریح ایبٹ آباد گئے تھے
اور یہ نظم انھوں نے اُس جگہ بیٹھ کر لکھی تھی جہاں
اب میونسپل کمیٹی کا باغ ہے۔ سربن کی چوٹی اُس
باغ کے عین مقابل نظر آتی ہے۔'' [2]

اِس طرح کے بیانات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اکثر مقامات پر پروفیسر چشتی صاحب نظم کا خلاصہ اِس تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں کہ وضاحت کی کہیں کوئی بھی گُنجائش نہیں رہتی۔ اور کہیں ساری کی ساری نظم کو یوں ہی چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔

علاّمہ اقبالؔ کے اُردو مجموعے 'ضربِ کلیم' کا مطالعہ کرنے سے

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بانگِ درا مع شرح۔ ص ۔ 223 - 222

[2] پروفیسر یوسف سلیم چشتی بانگِ درا مع شرح۔ ص ۔ 223

اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ علّامہ اقبالؔ نے دنیا کے تمام مسائل پر اسلامی زاویۂ نگاہ سے تنقید کی ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب نے 'ضربِ کلیم' کی شرح میں مقدمہ درج کرنے کے بعد نظموں کی تشریح کی ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے کلام یا اشعار کو شاملِ کتاب نہیں کیا ہے، جس کے سبب قاری کو مطالعے کے دوران مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جہاں تک اِس مجموعے کے عنوان کا تعلق ہے، پروفیسر صاحب نے شرح سے پہلے اِس پر مفصل بحث کی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ علّامہ نے اِس کا نام 'ضربِ کلیم' کیوں رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> ''اِس کتاب کا نام 'ضربِ کلیم' رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اقبالؔ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اِس کتاب میں جو اشعار ہیں اُن اشعار میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں عصرِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں ضربِ کلیم کا اثر رکھتے ہیں اور علّامہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اِن خیالات پر عامل ہو کر اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس کی بدولت دورِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کر سکیں۔'' [1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضربِ کلیم مع شرح ۔ ص ۔ 7

'ضربِ کلیم' کی تمہید سے پہلے علاّمہ 'ناظرین سے' کہتے ہیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست وضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خونِ دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ، ہے غافل! نہ جل ترنگ

پروفیسر چشتی صاحب اِن اشعار کی تشریح میں قارئین کو اُس حقیقت سے آگاہ کراتے ہیں جس کے بغیر دنیا میں کوئی قوم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ لکھتے ہیں:۔

"اے مسلمان! جب تک تو زندگی کے حقائق کو پیشِ نظر نہیں رکھے گا، تیری ذات یا شخصیت جو باعتبار تخلیق شیشہ کی طرح کمزور ہے، حوادثِ روزگار کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔"[1]

مذکورہ اشعار میں 'زندگی کے حقائق' کی جو ترکیب استعمال کی گئی

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضربِ کلیم مع شرح۔ ص ۔ 17

ہے وہ 'ضربِ کلیم' ہی کی جان نہیں بلکہ اقبالؔ کے سارے فلسفے کی کلید ہے۔ علاّمہ اقبالؔ ساری عمر اسی کوشش میں مصروف رہے کہ قوم اُن صداقتوں کا علم حاصل کرے، جن پر بنی آدم کی حیات موقوف ہے۔ اِس کے بعد کتاب کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ اِس عنوان کے تحت اقبالؔ نے اپنے خیالات دو حصّوں میں ظاہر کئے ہیں۔ پہلے حصے میں اُنھوں نے ایشیائی اقوام سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصاً خطاب کیا ہے۔

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری
کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روح تریاکی!
عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھ کو
کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بے باکی!

یعنی مسلم اور غیر مسلم دونوں اپنی خودی سے غافل ہیں اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی اقوام کی روح خوابیدہ ہے۔ خودی کی بیداری کے لئے ہوش شرط ہے لیکن جو شخص یا قوم افیون کے نشے میں مست ہوا اُسکی خودی کیسے بیدار ہوسکتی ہے۔

تمہید کے دوسرے حصے میں اقبالؔ یہ نغمہ سُناتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کہ اسلام کی مخالف طاقتیں میری آواز کو دبانا چاہتی ہیں تاکہ میں مظلوم قوم کے اندر حریّت کا جذبہ پیدا نہ کرسکوں۔

ترا گناہ ہے اقبالؔ مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند!
تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقامِ شوق و سرور و نظر سے محرومی!

اگرچہ میں زمانہ کی مانند کم پیوند ہوں، کسی سے تعلق نہیں رکھتا، لیکن اِس کے باوجود میں نے مجلس آراستہ کردی ہے، یعنی بہت سے لوگ میرے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ اسلام کی مخالف طاقتیں' یہ چاہتی ہیں کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ میں نوائے سحر اور مقامِ شوق سے محروم ہو جاؤں، تاکہ محکوم قوموں کے اندر حریّت کے جذبات پیدا نہ کرسکوں۔

پروفیسر چشتی صاحب نے 'ضربِ کلیم کی شرح کرتے ہوئے اِس بات کا اِعادہ کیا ہے کہ یہ شرح خاص طور سے طلبہٰ کے لئے لکھی گئی ہے تا کہ انھیں اقبالؔ فہمی میں سہولت ہو سکے۔ اِس بات کا اعتراف پروفیسر صاحب اِن الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''میں یہ جانتا ہوں کہ..... یہ شرح میں
کالج کے طلبہٰ کے لئے لکھ رہا ہوں۔'' [1]

پروفیسر صاحب نے 'ضربِ کلیم' کی شرح میں اختصار سے کام لیا ہے، تا کہ قاری کو شعر کا مفہوم سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

''اگر طلبہ اقبالؔ کے پیغام کو ذہن نشیں کر سکیں
گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اُن کے مقصد کی تکمیل
کے لئے کچھ کوشش بھی کریں گے۔ یہی وجہ ہے
کہ میں نے ہر جگہ اختصار سے کام لیا ہے۔ ورنہ

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضرب کلیم مع شرح۔ ص ۔ 9

اِس کتاب میں ایسے بہت سے اشعار ہیں کہ اُن
کی شرح کے کئے سینکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔'' [1]

اِس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے کس جذبہ کے تحت علاّمہ اقبالؔ کے کلام کی شرح کی ہے۔ اپنے اِس جذبے کا اِظہار پروفیسر صاحب نے اِن الفاظ میں بھی کیا ہے:۔

''میں نے صرف اللّٰہ کی تائید کے بھروسے پر کلامِ
اقبالؔ کی شرح کا سلسلہ شروع کیا ہے اور اللّٰہ سے ہی
التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت
کی توفیق عطا فرمائے۔'' [2]

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ شرح کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے 'ضربِ کلیم' کے اشعار کو شامل نہیں کیا ہے اور نہ ہی نظموں کے عنوانات درج کئے ہیں۔ اور مطالعے کے دوران قاری کو مشکل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ہر شعر کی الگ الگ تشریح کی ہے اور نظموں کو نمبرات سے ترتیب کیا ہے۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضربِ کلیم مع شرح۔ ص ۔ 24

[2] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضربِ کلیم مع شرح۔ ص۔ 25

تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شعر کے مفہوم کو آسان سے آسان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ اور نظموں کا خلاصہ پیش کرنے کے بجائے تشریح سے کام لیا ہے۔

'ضربِ کلیم' کی پہلی نظم 'صبح' میں علّامہ اقبالؔ اسلامی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہی بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

یعنی یہ سحر جس سے ہم کل اور آج کا شمار کرتے ہیں کیسے اور کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ سحر جس سے یہ کائنات کانپ اُٹھتی ہے، وہ بندۂ مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی مومن کے نعرۂ تکبیر 'اللّٰہُ اَکبَرُ' میں ایسی تاثیر ہے کہ ساری کائنات لرز اُٹھتی ہے اور بڑے بڑے بُت سہم جاتے ہیں۔

پروفیسر صاحب مذکورہ اشعار کی شرح میں نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ایک سحر تو وہ ہے جو طلوعِ آفتاب سے پیدا ہوتی ہے اور اُس کی مدد سے ہم ماہ و سال کا شمار کرتے ہیں۔ لیکن ایک سحر اور بھی ہے جیسے ایوانِ وجود میں زلزلہ پڑ جاتا ہے اور وہ سحر، مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے۔'' [1]

اِس سے قطع نظر اگر 'ضربِ کلیم' کی ہی ایک اور نظم 'شکر و شکایت' کی شرح کا مطالعہ کریں تو وہاں بھی پروفیسر صاحب نے بالکل آسان اور مختصر الفاظ میں تشریح کی ہے۔

لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند!

لیکن بڑے رنج کے ساتھ میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ایسے ملک میں پیدا کیا جس ملک کے لوگ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، لیکن انگریز کی غلامی پر راضی

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضربِ کلیم مع شرح۔ ص ۔ 27

ہیں۔تعجّب ہے کہ وہ کلمہ تو تیرا پڑھتے ہیں لیکن اِطاعت انگریز کی کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب اِس نظم (شکر و شکایت) کی شرح کے آخر میں نظم کے شاعرانہ اندازِ بیاں کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

> ''واضح ہو کہ یہ نظم' دراصل ایک لطیف شاعرانہ انداز بیاں کی حامل ہے۔اِس نظم کے ذریعے سے اقبالؔ دراصل اپنی قوم سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو مسلمان کافر کی غلامی پر رضامند ہو اور اُس غلامی سے رہائی کی کوشش نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں۔کیونکہ اللہ کا بندہ' انگریز کا بندہ کیسے ہوسکتا ہے:
>
> یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ![1]

ضربِ کلیم کی شرح کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں پروفیسر صاحب نے کہیں کہیں طوالت سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر نظم 'توحید' میں اقبالؔ نے اسلامی عقیدۂ توحید کے

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضربِ کلیم مع شرح۔ ص ۔ 56

حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ نظم کے پہلے شعر کی شرح میں پروفیسر صاحب نے کافی وضاحت سے کام لیا ہے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اِک مسئلہ علمِ کلام!

پروفیسر صاحب اِس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

''ایک زمانہ تھا جب مسلمان قرآن وحدیث کو سمجھ کر پڑھتے تھے اور توحید کے اقتضاء پر عمل کر کے دنیا میں قوت اور شوکت کے مالک تھے۔ اقتضاء پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو زبان سے کہتے تھے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتے، تو واقعی اُن کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔ لیکن آج کیا حالت ہے؟ مسلمانوں نے توحید کے اقتضاء پر عمل کرنا چھوڑ ہی دیا ہے۔ اِس کا مفہوم بھی مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا ہے۔ اب رہے علماء تو اُن کی کیفیت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید اُن کی نظر میں علمِ کلام[1] کا ایک مسئلہ بن گیا ہے،

---

[1] علم کلام وہ علم ہے جس میں اسلامی عقائد کا فلسفہ بیان کیا جاتا ہے اور ان کو عقل کے مطابق ثابت کیا جاتا ہے اور غیروں کے اعتراضات کے جواب دئے جاتے ہیں۔

یعنی وہ صرف اِس پر اکتفا کرتے ہیں کہ شرح مقاصد اور
شرحِ مواقف میں توحید سے متعلق جو علمی اور منطقی بحثیں
ہوتی ہیں، اُن کا اجمالی علم حاصل ہو جائے' توحید کا تقاضا
کیا ہے؟ اِس سے اُن کو بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔'' [1]

'محراب گل افغان کے افکار' کا مطالعہ کرنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اِس نظم میں افغانوں کو خودی پیدا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور اقبالؔ نے اِس نظم میں در پردہ مسلمانوں کو اِس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ کوہستانی زندگی' خودی کی تربیت کے لئے بہت موزون ہے۔ پروفیسر صاحب نے شرح سے پہلے تحریر کیا ہے کہ علامہ اقبالؔ نے یہ بات خود مجھ پر ظاہر کی تھی؛ لکھتے ہیں:۔

''علّامہ نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان
تو کئی سو سال سے غُلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انگریز کا
مقابلہ اگر کر سکتے ہیں، تو وہ مسلمان کر سکتے ہیں، جو پشاور اور

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضربِ کلیم مع شرح۔ ص ۔ 61

کابُل کے درمیانی علاقے میں رہتے ہیں! کاش اللہ کا کوئی
بندہ اُن کو ہستانی شیروں کو بیدار کر سکے۔"[1]

'محراب گل افغان کے افکار' کی ساتویں نظم کی شرح کا مطالعہ کریں تو چشتی صاحب کہتے ہیں کہ اس نظم کے ذریعے علامہ نے افغانوں کو انقلاب کا پیغام دیا ہے۔

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان!

یعنی اے سرحد کے غیور مسلمانو! اللہ نے تمہیں جسمانی طاقت بھی عطا فرمائی ہے، حوصلہ بھی عطا کیا ہے اور جنگ و جدل کا شوق بھی۔ پس اگر تُم اسلام کے کھیت کی آبیاری نہ کرو، تو پھر تمہاری مسلمانی کس کام کی؟ اور اسلام کو تُم سے کیا فائدہ پہنچا؟

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ضرب کلیم مع شرح۔ ص ۔ 338

پروفیسر چشتی صاحب نے شرح کرتے ہوئے افغانیوں کی ہمت اور غیرت کا نہایت ہی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ افغانیوں میں جہاد کا جذبہ نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے اور اُن لوگوں کو انگریز اور انگریزیت دونوں سے شدید نفرت ہے۔ یہ لوگ فطرتاً بہادُر بھی ہیں اور جفاکش بھی۔ یعنی علاّمہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ وہ اپنے اندر خودی پیدا کریں؛ جہاد کا جذبہ پیدا کریں۔

'ارمغانِ حجاز' میں کوئی غزل نہیں ہے۔ اِس مجموعے میں فقط اقبالؔ کی نظمیں اور رُباعیات درج ہیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز کی نظموں کا مِلٹن (Milton) کی شاعری کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''اگر اقبالؔ مرحوم چند سال اور زندہ رہ جاتے تو وہ
> مِلٹن کی طرح تمثیلی شاعری اختیار کر لیتے۔''[1]

پروفیسر چشتی اِس کتاب کی شرح کے آغاز میں یعنی پہلی ہی نظم کے پہلے شعر کے بارے میں غور طلب بات بیان کرتے ہوئے لکھتے

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ ص ۔6

ہیں کہ شیکسپیئر (Shakespeare) نے اپنے مشہور ڈرامہ (TWELFTH NIGHT) کا آغاز اِس جملے سے کیا ہے:۔

"اگر یہ سچ ہے کہ موسیقی عشق کی غذا ہے تو مجھے یہ غذا اتنی
زیادہ مقدار میں دو کہ میں کھاتے کھاتے اُکتا جاؤں۔"[1]

حق یہ ہے کہ ایک ہی جملہ، قائل کی پوری سیرت کا آئینہ دار ہے۔ اِسی طرح علاّمہ اقبالؔ نے اِس نظم کی ابتداء اِس مصرع سے کی ہے۔

یہ عناصر کا پُرانا کھیل! یہ دُنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمنّاؤں کا خوں

اِس میں کوئی شک نہیں کہ دو لفظوں میں ابلیسیت کی پوری روح کھینچ کر رکھ دی ہے۔ دُنیا کو 'عناصر کے پُرانے کھیل' سے تعبیر کرنا اِبلیس کی تعلیمات کا سنگِ بُنیاد ہے کیونکہ ابلیسیت کی تمام صورتیں تصوّر سے پیدا ہوتی ہیں کہ دُنیا عناصُر مادی کا پُرانا کھیل ہے۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ ص ۔ 14

جین دھرم، بودھ دھرم، مادہ پرستی، مارکسزم، ہیومزم، سوشلزم، کمیونزم وغیرہ اور اِسی قبیل کے دوسرے ازموں کی بُنیاد یہی ہے کہ یہ دُنیا عناصرِ مادی کا پُرانا کھیل ہے۔

'سکنانِ عرشِ اعظم' کنایہ ہے فرشتوں سے جو اِس دُنیا میں خلافتِ دُنیا بُت الہیہٰ کے اُمّید وار تھے۔ لیکن اللّٰہ 'تبارک وتعالیٰ' نے جب حضرتِ آدم 'علیہ السّلام' کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تو اُن کی تمنّاؤں اور آرزؤں کا خون ہوگیا۔

اِس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پروفیسر چشتی کس خوبی سے اور تفصیل سے کلامِ اقبال کی شرح کر دیتے ہیں۔ پروفیسر چشتی اِس نظم کی اہمیت و افادیت کے بارے میں پوری تفصیل سے کتاب کی تمہید میں خلاصہ بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تا کہ شرح پڑھنے سے پہلے قاری اِس نظم کے ہر پہلو سے واقف ہو جائے۔ یہ علّامہ اقبال کی تمثیلی نظم ہے اور اُردو ادب میں ایک شاہکارہ کا درجہ رکھتی ہے۔ پروفیسر صاحب تمثیل کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''اِس میں شاعر اپنا مافی الضمیر کنایات اور استعارات
کے ذریعے سے بیان کرتا ہے۔ چنانچہ اِس شعر میں اِسی
حقیقت کی طرف کیا گیا ہے ۔
خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں''[1]

اِس تمثیلی نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اقبالؔ مسلمانوں کو اِس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ دُنیا میں اگر کوئی نظام حیاتِ یا دستورالعملِ ابلیسی نظام کو شکست دے سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔ چونکہ ابلیس اِس نکتہ سے واقف ہے اسلئے وہ اِس دین کو فنا کرنے پر کمربستہ ہے۔

ہاں اگر مجھ کو کوئی خطرہ ہے تو مسلمانوں سے ہے۔ اندریں حالات مسلمانوں کو فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں ابلیسی نظام کو تہ و بالا کرنے مبذول کر دیں۔ نظم کی شرح کے بعد پروفیسر چشتی اِس نظم پر تبصرہ کرتے ہیں، جو اُن کے پختہ ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ ص ۔ 8

ارمغانِ حجاز کی رُباعیات میں بھی علاّمہ اقبالؔ اکثر مقامات پر اللہ کے ساتھ شوخیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر

کہا تصویر نے تصویر گر سے
نمائش ہے مری تیرے ہنر سے
ولیکن کس قدر نا منصفی ہے
کی تو پوشیدہ ہو میری نظر سے

پروفیسر صاحب مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان نے خدا سے کہا کہ اِس میں تو کوئی شک نہیں کہ میری ہستی تیرے فعل تخلیق (ہنر) پر موقوف ہے۔ یعنی میرا وجود ذاتی، حقیقی یا مستقل نہیں ہے بلکہ تیری صفتِ خالقیّت کا کرشمہ ہے۔ لیکن اے خدا! یہ بات میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے (نا منصفی) ہے کہ تو میری نظر سے پوشیدہ ہے۔

پروفیسر صاحب مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آخری مصرع میں دراصل اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کے دیکھنے یا اُس سے ملاقات کرنے کی آرزو پوشیدہ

ہے۔ اِس حقیقت کو مشرقی اور مغربی دونوں شعراء نے اپنے کلام میں واضح کیا ہے۔ مثلاً انگریزی ادب میں ورڈسورتھ، کالرج اور براؤننگ کی شاعری میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب ارمغانِ حجاز کی شرح کرتے ہوئے اکثر مقامات پر قرآنی آیات درج کر کے اُس شعر کی تشریح کے پوشیدہ مفاہیم کو واضح کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر

کبھی دریا سے مثلِ موج اُبھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خوشی کا فاش تر کر

دریا سے مثلِ موج اُبھرنا اور کبھی اُس کے سینے میں اُترنا، اِن دونوں باتوں کا مطلب ہے آفاق (قبائے فطرت) کا مطالعہ اور اُس کی تسخیر۔ دریا کے ساحل سے گذرنا، اِس سے مُراد ہے خود اپنی ذات میں غور کرنا جو کائناتِ صادّی سے جداگانہ ایک روحانی حقیقت ہے۔ گویا خودی کو فاش کرنے کے یہی دو طریقے ہیں اور اقبالؔ نے

یہ دونوں طریقے قرآنِ مجید کی اِس آیت سے اخذ کئے ہیں:

﴿وَفِي الْأَرْضِ اٰيَاتٌ لِّلْمُوْمِنِيْنَ ۝
وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾

'(اے لوگو! اگر تُم جویائے حقیقت ہو تو) یقین کرنے والوں کے لئے زمین (کائناتِ خلقت) میں ہماری ہستی کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں اور خود تُمہارے اندر ہماری ہستی پر بہت سے دلائل پوشیدہ ہیں۔ پس کیا تُم آفاق اور انفس پر غور نہیں کرو گے؟'

ارمغانِ حجاز کی ہی ایک مختصر نظم 'مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض' پر پروفیسر صاحب نے تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اِس عنوان کے بارے میں پروفیسر چشتی لکھتے ہیں:۔

''اِس عنوان کے تحت اقبالؔ نے اُنّیس (۱۹) نظمیں لکھی ہیں، جن میں سے دو نظمیں تو صرف ایک ہی ایک شعر کی ہیں۔ مُلّا زادہ ضیغم ایک فرضی نام ہے۔ ضیغم شیر کو کہتے ہیں۔ اِس سے مُراد یہ ہے کہ اقبالؔ کشمیریوں میں شیروں کی صفات پیدا کرنا چاہتے تھے۔''[1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ ص ۔ 237

پروفیسر چشتی اِس عنوان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''لولابی: وادیٔ لولاب کا باشندہ لولاب اُس وادی کا نام ہے جو سرینگر اور بارہ مولہ کے درمیان واقع ہے۔ چونکہ اِس وادی میں بہت سے علماء اور صلحاء پیدا ہوئے ہیں، اسلئے اقبالؒ نے اپنے ملّا زادہ کو لولابی قرار دیا ہے۔ امام العصر راس المحدّثین حضرت مولانا علّامہ سیّد انور شاہ صاحب مرحوم بھی اِسی وادی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں پیدا ہوئے تھے اور میری رائے میں لولاب کے لئے یہی فخر کافی ہے کہ شاہ صاحب جیسا یگانۂ روزگار انسان وہاں پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ مرحوم ہر فن میں مہارتِ نامہ رکھتے تھے لیکن حدیث میں بلاشبہ تمام دُنیائے اسلام میں کوئی شخص اُن کا ہمسر نہیں تھا۔''[1]

اِس نظم میں علّامہ اقبالؔ نے کشمیریوں کو حریّت کا پیغام دیا ہے۔ اُن کی زندگی کے آخری دور میں کشمیریوں کے اندر آزادی کی تڑپ پیدا ہوگئی تھی۔ اُن کی امداد کے لئے لاہور میں ایک کشمیر کمیٹی بھی قائم ہوئی تھی۔ علّامہ کے دل میں چونکہ ہر مظلوم طبقہ کے لئے

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ ص ۔ 238 ۔ 237

ہمدردی کا جذبہ موجزن تھا۔ اِس لئے انھوں نے کچھ عرصہ تک اُس کمیٹی کو بھی اپنے مشوروں سے مستفید کیا تھا۔ چنانچہ اِن نظموں میں انھوں نے اُس محبت کا ثبوت دیا ہے جو اُن کو اِس قوم کے ساتھ تھی۔ مثال کے طور پر ؎

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تری فضاؤں میں ہے بیتاب
اے وادیٔ لولاب!

اِن اشعار میں بتایا گیا ہے کہ اے باشندگانِ کشمیر! قدرت نے تمھیں ایسا حسن اور شاداب ملک عطا کیا جس کی مثال شاید دُنیا میں کہیں نہ ہوگی۔ یہاں کے چشموں کا پانی اپنی رونق، پاکیزگی اور صفائی کے اعتبار سے سیماب معلوم ہوتا ہے اور یہاں کی فضا اِس قدر دلکش اور مسرت انگیز ہے کہ مرغانِ سحر[1] کو نغمہ سرائی پر مائل کرتی رہتی ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے، اگر ایسے ملک کے باشندے غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہوں۔

پروفیسر چشتی اِس نظم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

---

[1] مرغانِ سحر وہ پرندے جو بالعموم صبح کے وقت چہچہاتے ہیں۔

''میری رائے میں جب تک دنیائے اسلام سے سے
ملوکیت کا خاتمہ نہیں ہوگا، مسلمانوں کی اصلاح یا اسلام کی
سربلندی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ گذشتہ ایک ہزار سال
میں اصلاح کی جس قدر کوششیں ہوئیں وہ سب
ناکامی کی آغوش میں سوگئیں۔ اِس لئے کہ مسلمانوں
کے زوال کا باعث نہ بے زری ہے، نہ جہالت بلکہ
ملوکیت ہے اور ملّا و پیر اِس غیر اسلامی نظام کے سب
سے بڑے معاون ہیں۔'' [1]

اِس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علّامہ اقبالؔ کو کشمیری قوم سے کتنی محبّت تھی۔ یہ نظم کشمیریوں کو حریّت کا پیغام دیتی ہے۔

ارمغانِ حجاز کی ہی ایک اور نظم میں علّامہ اقبالؔ کشمیریوں کی غلامی پر ماتم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس کا پہلا ہی شعر اُس کی وضاحت کرتا ہے۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم مجبور و فقیر
کل جِسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ارمغانِ حجاز مع شرح۔ ص ۔ 249

یعنی انقلابِ روزگار تو دیکھو آج وہ کشمیری غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جو اپنی نفاست، ذہانت، دانشمندی اور تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ایرانیوں کے ہم پلہ ہیں۔ اور پھر یہی قوم رفتہ رفتہ اپنے دل میں آزادی کی مشعل فروزاں کئے ہوئے ہیں اور علّامہ اقبالؔ اُن کے جذبات کچھ اِس طرح بیان کرتے ہیں۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو

یعنی جب غلامی کی ذلّت اور مصیبت سہتے سہتے غلام قوم زندگی سے عاجز آجاتی ہے تو اُس کے اندر آزادی کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس قوم کے افراد کا خون تاؤ کھانے لگتا ہے۔ یعنی جب وہ حکمرانوں کے ظالمانہ طرزِ عمل کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اُن کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ارمغانِ حجاز کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علّامہ اقبالؔ کس طرح مسلمانوں کے دلوں میں دین کی خصوصیات

بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؑ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

یعنی اے مسلمان! تیرے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب تو اپنے اندر انقلاب پیدا کر۔ یعنی خانقاہوں سے نکل کر باطل کے مقابلہ میں صفِ آرا ہو جا۔ کیونکہ خانقاہوں میں تو جس فقر کی تعلیم حاصل کر رہا ہے، اُس کا نتیجہ مایوسی اور رنج و غم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اِس مجموعے میں علّامہ اقبالؔ اکثر مقامات پر آزادی کے نعرے بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ آزادی کی زندگی کا سرمایہ یہ ہے کہ اُس کا دل پاکیزہ خیالات کا مرکز ہوتا ہے اور اُس کی شخصیت ہمت اور حوصلہ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ علّامہ اقبالؔ نے جس جذبہ کے تحت یہ اشعار قلم بند کئے ہونگے، پروفیسر چشتی صاحب نے اُن اشعار کی شرح میں اُن جذبات کو اُسی جذبہ سے بیان کیا ہے جو جذبہ اقبالؔ

کے یہاں اُس وقت رہے ہونگے۔

'اسرارِ خودی' علّامہ اقبالؔ کا پہلا فارسی مجموعۂ کلام ہے۔ اِس کی تشریح میں پروفیسر یوسف سلیم نے خاصی وضاحت سے کام لیا ہے۔ کتاب کے پیشِ لفظ میں پروفیسر صاحب رقمِ طراز ہیں:۔

''میرے نانا صاحب مرحوم نے مثنوی 'اسرارِ خودی' کا ایک نسخہ مجھے عنایت فرمایا۔ میں اُس وقت تک علّامہ کے کلام اور پیغام دونوں سے نا آشنا تھا۔ اگرچہ اُن کی شہرت کا آفتاب پنجاب میں طلوع ہو چکا تھا، میں نے اُس کتاب کو بڑے اشتیاق کے ساتھ کھولا لیکن پہلے ہی شعر میں اٹک کر رہ گیا۔

پیکرِ ہستی زِ آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی زِ اسرارِ خودی است

اشعار سے قطع نظر کر کے عنوان پر توجہ کی لیکن وہ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اِس سے پہلے خودی کا لفظ اِس مفہوم میں میری نظر سے کہیں نہیں گزرا تھا۔ اس لئے کتاب ختم کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔'' [1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 5

کلامِ اقبالؔ کی دشواریوں کا اندازہ کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ خود مصنف سے راہ و رسم پیدا کریں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"ایک دوست کی معیت میں پہلی مرتبہ علامہ اقبالؔ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جب کچھ دنوں کے بعد مرحوم کے مزاج میں کسی قدر دخل حاصل ہو گیا تو ایک دن دبی ہوئی زبان سے یہ عرض کی کہ اسرار اور پیام دونوں کتابیں سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن اُن سے قطع نظر بھی نہیں کر سکتا۔ دماغ قاصر سہی لیکن دل اُن کی طرف مائل ضرور ہے۔ یہ سن کر علّامہ نے فرمایا کہ اسرارِ خودی کتنی مرتبہ پڑھی ہے؟ میں نے کہا ساری کتاب تو نہیں پڑھی، پہلا باب پڑھا لیکن سمجھ میں نہیں آیا۔ اِس لئے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ پیامِ مشرق کی غزلیں تو پڑھ لی ہیں لیکن لالۂ طور تک رسائی ہوئی نہ نقشِ فرنگ تک۔"[1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 7

پروفیسر چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سن کر علاّمہ نے فرمایا:۔

"خوش نویسی یا موسیقی ایک دن میں نہیں آسکتی ہیں؟ فلسفیانہ نظمیں ایک دفعہ پڑھنے سے کیسے اور کیونکر سمجھ میں آسکتی ہیں۔ الفارابی نے ارسطو کی مابعد الطبیعات کو کئی سال تک مسلسل پڑھا تھا۔ تُم بھی اُس کی تقلید کرو اور اُن کتابوں کو بار بار پڑھو۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لو۔" [1]

پروفیسر صاحب نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی دونوں کتابوں کو از سرِ نو پڑھنا شروع کیا اور علاّمہ کی خدمت میں بھی وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہے اور اُس کے ساتھ ساتھ پروفیسر صاحب نے قرآنِ حکیم کا بھی مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ پروفیسر چشتی نے جب علاّمہ اقبالؔ کے کلام کی شرح کی تو ان سے اپنی بے لوث محبّت کا اظہار واضح طور پر کیا ہے۔ چناچہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔7

''علّامہ کے اشعار پڑھنے سے میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔اور اِن اشعار سے میرے ذہن میں اقبالؔ کے خلوص کا ایسا نقش قائم ہوگیا جو آج بھی اُسی طرح چمک رہا ہے۔'' [1]

جیسا کہ پہلے ہی مذکور ہو چکا ہے کہ اسرارِ خودی کی شرح میں پروفیسر صاحب نے تفصیل سے کام لیا ہے۔یعنی شروع سے لیکر کے آخر تک ہر چیز کو زیرِ بحث لایا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اِس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے سے دو نئی باتیں معلوم ہوئیں۔پہلی بات یہ کہ اگر علّامہ اقبالؔ کے فارسی کلام کو سمجھنے کی خواہش ہو تو قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اقبالؔ انسانوں سے جھوٹ بول سکتے ہیں لیکن 'شہنشاہِ کونین' کے سامنے غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ کہ اقبالؔ کی نظر میں 'سرکارِ دو عالم ﷺ' اپنی امّت کے دلوں کا حال جانتے ہیں۔

اسرارِ خودی کی اشاعت سے قبل علّامہ اقبالؔ نے اپنے چند دوستوں کو خطوط لکھے تھے کہ اِس مثنوی کے لئے کوئی موزوں نام تجویز کریں۔ بہر حال مختلف ناموں میں سے 'اسرارِ خودی' اقبالؔ کو

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 8

پسند آیا۔ اِس کی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ مثنوی کے پہلے ہی شعر میں مستعمل ہے۔

پیکرِ ہستی زِ آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی زِ اسرارِ خودی است

علّامہ اقبالؔ نے اِس مثنوی میں بلا شبہ خودی کے اسرار واضح کیئے ہیں، جن سے مسلمان صدیوں سے بے گانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ مثنوی شائع ہوئی تو اِس کا خیر مقدم 'شکوہ' کی طرح گرم جوشی کے ساتھ نہیں کیا گیا، کیونکہ عام لوگوں کے مذاق سے قطعی مختلف تھا اور اِس کی زبان فارسی تھی۔ جیسا کہ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

''اول تو اِس کی زبان فارسی ہے، دوسرا یہ کہ مضامین غیر مانوس تھے جن سے طبائع کو کوئی مناسبت نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ کتاب کا نام ہی عوام اور خواص دونوں کے لئے بالکل نیا تھا اور خودی کا مفہوم متوسط درجہ کی عقول سے بلا شبہ بالاتر تھا۔'' [1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 14 - 15

پروفیسر چشتی صاحب نے اسرارِ خودی کے دیباچہ میں علّامہ اقبالؔ کے اُن دو خطوں کو بھی شاملِ اقتباسات کیا ہے جن کے مطالعہ سے اسرارِ رموز کے معانی اور مطالب بآسانی واضح ہو سکتے ہیں۔

اقبالؔ کے کلام میں زندگی ہے، توانائی ہے، استغنا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے ابدی حقایق کا بیان ہے۔ وہ اِس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ملّتِ ابراہیمی، دارالفناء میں داخل ہو جائے۔ خواہ اس کا راہنما افلاطونِ اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ اقبالؔ کاروانِ ملّت کا سالار ہے اور اُن کی منزلِ مقصود حرمِ محرم ہے۔ اُن کی شخصیت اِس مثنوی سے پوری طرح نمایاں ہے۔ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو بعض صوفی اور پیر اقبالؔ کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ورغلایا کہ اقبالؔ کو دار پر کھینچ دو، کیونکہ یہ لوگوں کو مغربی مادیت کی تعلیم دے رہا ہے۔ مخالفین کے اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا اور انھیں اِس بات کا زیادہ ملال تھا کہ علّامہ نے اِس مثنوی میں تصوّف کی بحث میں حکیم افلاطونؔ یونانی اور خوجہ حافظؔ شیرازی کو 'گوسفند' لکھا ہے۔

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گوسفندے در لباسِ آدم است
حِکم او بر جانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

پہل شعر میں اقبالؔ نے افلاطونؔ کو 'راہبِ دیرینہ' قرار دیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ رہبانیت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ خود تو راہب نہیں تھا لیکن چونکہ اُس کی بنیادی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ رہبانیت کو تقویت حاصل ہوگئی۔ اِس لئے اقبالؔ نے اُسے 'راہب' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب نے اسرارِ خودی کی شرح میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ہر لفظ کی وضاحت کی ہے تا کہ قاری کو

مطالعہ کرتے وقت کوئی بھی مشکل پیش نہ آئے اور اِس بات کا بالکل بھی احساس نہ ہو کہ ہم فارسی کلام کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ''راہب'' کی تفصیل میں پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

> ''راہب رَھبۃ اسمِ فاعل ہے بمعنی ڈرنے والا، رَغبۃ بمعنی خوف، لیکن اصطلاح میں نصرانی عابد کو کہتے ہیں۔ اِس کی جمع رہبان آتی ہے۔ راہب سے مُراد ہے وہ شخص جو اللہ کے ڈر سے دُنیا کو ترک کر دے۔'' [1]

دوسرے شعر کا مطلب پروفیسر صاحب نے یوں بیان کیا ہے کہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ بہت سے مسلمان حکماء اور صوفیہ افلاطونی خیالات سے متاثر ہو گئے اور اُن کی بدولت آج بھی یہ فلسفہ ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔ لیکن اِس کا فلسفہ خواب آور ہے یعنی قوّتِ عمل کو مُردہ کر دیتا ہے۔

تیسرے اور چوتھے شعر کے معنیٰ کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ چونکہ افلاطون خیالی دُنیا میں رہتا تھا، اِسلئے وہ اِس عالمِ مادی

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 336

(ہنگامۂ موجود) کا منکر ہوگیا۔ اور اِس نے اِس دُنیا کے بجائے ہماری توجہ ''اعیانِ نامشہود'' کی طرف منعطف کردی۔ اعیان کے معنی ''آنکھیں'' کے ہیں۔ لیکن ''اعیانِ نامشہود'' اقبالؔ کی اصطلاح ہے اور اِس کو انھوں نے ''مُثلِ افلاطونی'' کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

پروفیسر صاحب نے شرح کے بعد اِن اشعار پر تبصرہ کیا ہے۔ جن میں افلاطون کے نظریئے اور علاّمہ کے نظریات کا موازنہ کیا گیا ہے، جو اُن اشعار کے مفاہیم کو پوری طرح واضح کردیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ افلاطون کی کن تعلیمات سے اقبالؔ کو اختلاف ہے۔

افلاطون کی تعلیم یہ ہے کہ یہ کائنات ایک عقلی کائنات ہے۔ یعنی ایک روحانی نظام ہے۔ تمام وہ اشیاء جو حواسِ خمسہ سے محسوس ہوتی ہیں، یہ سب اُن اعیانِ ثابتہ (Ideas) کے بھاگتے ہوئے سائے ہیں جو غیر متغیر اور ازلی ہیں۔ یہ مادی اشاءِ فانی ہیں صرف باقی ہی حقیقی ہے۔ صرف عقل ہی ایک فلسفی کی نگاہ میں قابلِ قدر شے ہے، جس کے حصول کی کوشش انسان کا فرض ہے۔

علاّمہ اقبالؔ نے افلاطون کے پورے نظام پر تنقید نہیں کی ہے، بلکہ صرف اُس پہلو پر جس کا تعلق ''خودی'' اور اُس کے مستقبل سے ہے۔ اِس لئے انھوں نے افلاطون کے نظریہ کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ بلکہ اسرارِ خودی کے علاوہ پیامِ مشرق اور ضربِ کلیم میں بھی افلاطون کے طلسم کا ابطال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر۔

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اُس کا
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطون

اقبالؔ نے ''اسرارِ خودی'' میں خودی کا پیغام دیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ اگر اپنی خودی مستحکم کرنا چاہتے ہو تو اپنی خواہشات پر غلبہ حاصل کرو۔ اگر تمہارا نفس تُم پر حکمراں ہے تو تُم اپنی خودی کو ہرگز پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ''اسرارِ خودی'' کے دیباچہ میں اِس مثنوی کی خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

''اقبالؔ کو یقین تھا کہ اگر مسلمان اِس مثنوی کا مطالعہ
کریں گے تو اُن کی موجودہ حالت میں انقلاب پیدا
ہو جائے گا۔'' [1]

علامہ اقبالؔ کی رائے میں شاعروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اپنی شاعری سے نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کرتے ہیں، یعنی اُن کے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ دوسری قسم اُن شعراء کی ہے جو حکماء کی طرح حقائق کی جستجو میں منہمک رہتے ہیں۔ ''در حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ'' میں اقبالؔ نے شعر و شاعری کی حقیقت واضح کی ہے اور اربابِ قوم کو مشورہ دیا ہے کہ لٹریچر (Literature) پیدا کریں۔ یہ عنوان چار بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں شعر و شاعری کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور ضمناً حقیقی شاعری کے محاسن بھی بیان کر دئے گئے ہیں۔ دوسرے بند میں اِس قوم کی بدبختی کا ماتم کیا گیا ہے، جس کے شعراء قوم کی زندگی کے حقائق سے فرار کی تلقین کرتے ہیں۔ تیسرے بند میں اقبالؔ نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے کہ جھوٹے شاعروں نے پوری قوم کو

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 26

ذلیل وخوار کر دیا ہے۔ اِس لئے اُن کے کلام سے اجتناب کرنا لازم ہے۔ چوتھے بند میں مسلمان شعراء کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ ایسی شاعری کریں جس کے مطالعے سے قوم کی تعمیر ہو اور وہ حرکت و عمل پہ آمادہ ہو۔

پروفیسر صاحب نے اِس کی شرح میں مثالوں سے کام لے کر بڑے حسن و خوبی کے ساتھ مفاہیم واضح کر دیئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:۔

''از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر
اِس شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا:
نگہ ایسی ہے اُس کی، خوب کو جو خوب تر کر دے
وہ افسوں اُس کا ہے فطرت کو جو محبوب تر کر دے''[1]

اِسی بند کا ایک اور شعر۔

سوزِ او اندر دلِ پروانہ ہا
عشق را رنگیں از افسانہ ہا

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرار خودی مع شرح۔ ص ۔ 357

پروفیسر صاحب اِس شعر کی تشریح میں وضاحت سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جب ایک سائینسدان شمع کے گرد پروانوں کا ہجوم دیکھتا ہے تو اُس کی عقلی توجیہہ پیش کرتا ہے، کہ پروانے روشنی کو پسند کرتے ہیں۔ اِس لئے شمع کے پاس آتے ہیں لیکن جب ایک شاعر اُن پروانوں کو شمع کا طواف کرتے دیکھتا ہے تو اُسے اِس میں حضرتِ عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یعنی پروانہ شمع پر عاشق ہے اِس لئے اُس پر نثار ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ شاعر چونکہ خود عاشق ہوتا ہے اِس لئے اُسے ہر جگہ حسن و عشق ہی کا جلوہ نظر آتا ہے" [2]

پروفیسر چشتی صاحب کی شرحِ اسرارِ خودی کا مطالعہ کرنے سے اِس بات کا احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ جو لوگ فارسی زبان سے واقف نہیں ہیں لیکن علّامہ اقبالؔ کے کلام سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، پروفیسر صاحب کی یہ شرح اُن کی دُشواریوں کو آسان کر دینے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اِس کتاب کی

---

۲ پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 359

شرح میں اختصار سے کام لیا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب نے اپنی طرف سے شرح کا کماحقہ حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اِس میں راہ پا گئی کوتاہیوں کا انھیں بخوبی احساس ہے۔ وہ علامہ اقبال کی اِس آرزو: ''میرا نورِ بصیرت عام کردے'' کو پورا کرنے کے شدت سے خواہاں تھے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''اگرچہ میں نے اِس شرح کو ازسرِ نو لکھا ہے لیکن پھر بھی مجھے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے تشریح کا حق ادا کر دیا ہے۔ اربابِ علم سے توقع ہے کہ وہ مجھے میری کوتاہیوں سے مطلع فرمائیں گے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اقبال کے پیغام کی روح سے آشنا ہو جائیں تاکہ مرحوم کی.....آرزو پوری ہو سکے۔''[1]

مثنوی اسرارِ خودی کی طرح مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں بھی علامہ نے خودی کے اسرار واضح کئے ہیں۔ اِس مثنوی کے مطالعے سے ہر شخص اسلام کے بنیادی افکار، اصول اور ارکان سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے مقدمہ کے بعد مثنوی کے مباحث پر ایک

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسرارِ خودی مع شرح۔ ص ۔ 13

نظر ڈالی ہے۔ اور اُن مباحث کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک کامل اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اور اِس کے بعد اِس مثنوی پر تبصرہ کیا ہے۔ جس میں علّامہ اقبالؔ نے انسان کو دستورِ حیات کے بنیادی اصول سے آگاہ کیا ہے، جسے قرآنِ کریم نے دینِ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی صرف قرآن ہی حق ہے۔ اِس کے علاوہ جو کچھ ہے، سب باطل ہے۔ جہاں تک اِس مثنوی کے عنوان کا تعلق ہے، علّامہ اقبالؔ نے مُرشد رومیؒ کے اِس شعر کو اپنی کتاب کا عنوان بنایا ہے:۔

جہد کن در بیخودی، خود را بیاب
زودتر وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

پروفیسر چشتی صاحب اِس شعر کی وضاحت ذیل کے اِن الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"مرشد رومیؒ نے یہ شعر ایک شہزادے کی حکایت کے سلسلے میں لکھا ہے، جو دفترِ چہارم میں مذکور ہے"۔[1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی رموزِ بیخودی مع شرح۔ ص ۔ 25

اِس کے بعد قصہ بیان کرتے ہیں:۔

''ایک جادوگرنی ایک شہزادے پر عاشق ہوگئی اور اپنے جادو کے زور سے شاہزادے کو ایسا محسور کیا کہ وہ اپنی دُلہن کی طرف سے بالکل غافل ہوگیا اور اِس بدصورت جادوگرنی کے دم کا دیوانہ ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حسنِ اتفاق سے ایک ساحر کا اُس شہر میں گذر ہوا۔ بادشاہ نے اُس سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ اُس نے اُس شہزادے کو اُس جادوگرنی کے تصّرف سے رہائی عطا کی۔'' [1]

یہ قصہ بیان کرنے کے بعد پروفیسر چشتی صاحب اِس قصہ کا اصل مقصد بیان کرتے ہیں جس سے اِس عنوان کے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''یہ حکایت بیان کرنے کے بعد مولانا کہتے ہیں کہ شہزادہ سے مُراد انسان ہے، جو خلیفۃ اللہ اور مسجودِ ملائکہ ہے۔ اور جادوگرنی سے مُراد یہ دنیا ہے، جس کی محبّت میں گرفتار ہوکر انسان اپنے محبوبِ حقیقی سے غافل ہوجاتا ہے۔'' [2]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی رموزِ بیخودی مع شرح۔ ص ۔ 25

[2] پروفیسر یوسف سلیم چشتی رموزِ بیخودی مع شرح۔ ص ۔ 26

مولانا رومیؒ کے نزدیک بیخودی حاصل کرنے کے بعد ہی انسان خودی سے آگاہ ہوسکتا ہے۔ مولانا کے یہاں ''بیخودی'' سے مُراد مقامِ فنا یا وصال ہے۔ لیکن اقبالؔ کے یہاں بیخودی سے مُراد انسان کا انفرادیت کی منزل سے نکل کر اجتماعیت کی منزل میں آنا ہے۔ یعنی اقبالؔ نے اِس شعر سے یہ مطلب برآمد کیا ہے کہ جب تک انسان انفرادیت کے دائرے میں محصور ہے، وہ اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا اور نہ اُن کو نقطۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے ''خودی'' اور ''بیخودی'' کے باہمی رشتہ کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ کیونکہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں اور مانتے بھی ہیں کہ خودی اور بیخودی میں تضاد کی نسبت ہے۔ لیکن اقبالؔ کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب اِس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

> ''اِس غلطی کا مبنیٰ یہ ہے کہ فارسی زبان میں لفظ 'بے' سے مرادنفی ہوتی ہے۔ مثلاً ہوشیار سے ہوش کی نفی کرنے کیلئے بے ہوش اور زَردار سے زَر کی نفی کرنے کے لئے بے زَر کی

ترکیب مستعمل ہے۔لیکن یہاں بیخودی سے خودی کی نفی
مُراد نہیں ہے۔یعنی بیخودی خودی کی ضد نہیں ہے بل
اِن دولفظوں میں عدم وملکہ کی نسبت ہے۔'' [1]

خودی ایک مفہومِ وجودی ہے اور بیخودی اِسی خودی کے عدم پر مشتمل ہے۔اور جو ذات' بیخودی کے وصف کے ساتھ موصوف مانی جائے وہ وہی ہوسکتی ہے جس میں خودی کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت موجود ہو۔ کیونکہ جو خودی کا موصوف نہیں بن سکتا، اُس کو ہم بے خود بھی نہیں کہہ سکتے۔ یعنی خودی اور بیخودی، یہ دونوں صفّات ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جاسکتی ہیں۔

غرض اقبالؔ کو مولانا رومیؒ کی مثنوی میں اپنے مطلب کا ایک ہیرا ترشا تراشا ہوا مل گیا جو ہمارے سامنے ''رموزِ بیخودی'' کی صورت میں ہے۔

اقبالؔ نے مثنوی کے آغاز میں ہی عرفیؔ کے اِس شعر کو اپنی پیشکش کا عنوان بنایا ہے ؎

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشّہ بمن نیست اگر باد گرے ہست

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی رموزِ بیخودی مع شرح۔ ص ۔ 23

یعنی عشق سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر میں وارداتِ عشق بیان کرتا ہوں تو اِن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عشق ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ اگر مجھ میں موجود نہیں تو دوسروں میں تو ہے۔

اقبالؔ نے اِس شعر کو زیبِ عنوان اس لئے بنایا کہ کتاب کی روح اِس پیشکش میں پوشیدہ ہے اور پیشکش کا خلاصہ ایک شعر میں مندرج ہے۔

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفیٰؐ، پیمانِ خویش

یعنی قوم کو عشقِ رسول (ﷺ) اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور یہ ساری کتاب اِسی ایک شعر کی تشریح و توضیح ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب نے مثنوی رموزِ بے خودی کی شرح کرتے ہوئے قرآنی آیت کا بھی حوالہ پیش کیا ہے تاکہ قاری کو مفاہیم سمجھنے میں کوئی دُشواری پیش نہ آئے۔ مثال کے طور پر ''درمعنی ایں کہ چوں مِلّتِ محمدؐ یہ موسّس بر توحید'' (مِلّتِ اسلامیہ کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں ہے)

آں کہ در قرآں خدا اورا ستود
آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دو عالم (ﷺ) سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ میں آپ کو انسانوں کی (شرارت) سے محفوظ رکھوں گا۔ چنانچہ وہ آیت یہ ہے:

﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَالنَّاسِ ۝ ﴾

(اور اللہ انسانوں (کی شرارتوں) سے آپ کو محفوظ رکھے گا)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہرِ او را کمال از ملّت است

اقبالؔ نے پہلے مصرع میں فرد کے لئے جماعت سے وابستگی کو ''رحمت'' قرار دیا ہے اور اربابِ علم جانتے ہیں کہ یہ لفظ نہ عاشقانہ ہے نہ فلسفیانہ بلکہ خالص اسلامی (قرآنی) ہے۔

اقبالؔ نے یہ لفظ قرآن مجید کی اِس آیتِ شریفہ سے اخذ کیا ہے:

وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ○

پروفیسر چشتی صاحب اِس شعر کی وضاحت میں یوں رقم طراز ہیں:۔

''مِلّت عربی زبان کا قدیم لفظ ہے اور اس کے معنیٰ
ہیں' مذہب یا مشربِ دین، قرآن وحدیث اور لغتِ
عرب میں یہ لفظ صرف اِس معنیٰ میں مستعمل ہے۔ مثلاً
مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ○ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین۔'' [1]

علاّمہ اقبالؔ نے اِس فلسفہ کو مختلف طریقوں سے اپنی تصانیف میں واضح کیا ہے، مثلاً

فردِ قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی رموزِ بیخودی مع شرح۔ ص ۔ 51

پروفیسر صاحب نے رموزِ بیخودی کے عنوانات کی شرح بھی مذکورہ کتاب میں درج کی ہے۔ اِس کے بعد ہر فصل کی تمہید پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''رُکنِ دوم'' رسالت کی تمہید میں پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

> ''اِس فصل میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کی ہماری قومیت کی بُنیاد وطن یا کوئی جغرافیائی خط یا نسل یا رنگ یا زبان نہیں ہے بلکہ رسالت ہے یعنی ہمیں حضرت ابراہیمؑ نے توحید کا سبق پڑھا کر ایک ملّت (قوم) بنا دیا۔'' [1]

رموزِ بیخودی کا مطالعہ کرنے سے اِس بات کا احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ علّامہ اقبالؔ نے اِس میں تسخیرِ یزداں کو مسلمان کا نسب العین قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان پر فرض ہے کہ اپنے اندر یزدانی صفّات کا رنگ پیدا کرے۔

اقبالؔ مسلمانوں کو تاریخ کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تاریخ وہ شئے ہے جو ہم کو ہماری حقیقت سے آگاہ کرتی

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی رموزِ بیخودی مع شرح۔ ص ۔ 132

ہے۔ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔ یہ ہمیں عمل اور جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے۔ ہماری روح کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ہماری قومی ہستی کو قائم رکھتی ہے۔ تاریخ قوم کے اندر جدوجہد کا ولولہ پیدا کرتی ہے:

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے!

علّامہ اقبالؔ قوم کو ملی تاریخ کے مطالعہ کی تلقین کرتے ہوئے اُسے اپنے ماضی سے رشتہ منقطع نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ اگر اِس کا تسلسل ٹوٹ گیا تو زندگی بھی ختم ہوجائے گی۔

''در معنی ایں کہ بقائے نوع از امومت است و حفظ و احترام امومتِ اسلام است'' یہ فصل دو بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں امومت کی اہمیت اور فضلیت بیان کی گئی ہے۔ دوسرے بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر عورت فرائضِ امومت سے دستکش ہوجائے تو اُس کا (امومت کا) خاتمہ ہوجائے گا۔

دونوں بندوں کی تشریح میں پروفیسر صاحب نہایت خوبی سے کام لیتے ہیں۔ اِس طرح کی سینکڑوں مثالیں مثنوی 'رموزِ بے خودی' کی شرح کا مطالعہ کرنے سے ملتی ہیں۔ شرح میں قرآنی احادیث اور اسلامی فکر کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

علّامہ اقبالؔ نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی، دونوں مثنویوں کے پردہ میں قوم کو بلکہ بنی آدم کو قرآنِ حکیم کے پیغام سے روشناس کرایا ہے۔ چنانچہ رموزِ بیخودی کے آخر میں اقبالؔ نے اپنے آقا اور مولیٰ سرکارِ دوعالم (ﷺ) کی بارگاہِ عالیہ میں اپنا حالِ دل بیان کیا ہے، جس کا عنوان ''عرضِ حالِ مصنف بحضورِ رحمتہ اللعالمین (ﷺ)'' ہے۔ اِس کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اِس کا ہر لفظ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر فقرہ خلوص سے معمور ہے۔ اور سرکارِ دوعالم (ﷺ) کی ذاتِ اقدس سے اقبالؔ کی بے پناہ محبّت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ؎

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

یعنی سرکارِ دوعالم (ﷺ) اِس کائنات میں صفّاتِ ایزدی کے سب سے بڑے مظہر ہیں۔ یعنی شانِ فقر آپؐ کی ذات میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ آپ کے واسطہ اور وسیلہ کے بغیر کوئی مومن ''مولیٰ صفات'' نہیں بن سکتا، یعنی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس مثنوی کا اہم جزبہ بھی ہے کہ علاّمہ اقبالؔ نے مثنوی کے مطالب کو سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس باب میں انھوں ن نے بہت ندُرتِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ اقبالؔ نے اس سورۃ سے جو صفات اخذ کی ہیں ان کا خلاصہ پروفیسر صاحب ذیل کے الفاظ میں درج کرتے ہیں:۔

''جس طرح اللہ تعالیٰ کسی طاقت کا محتاج نہیں ہے، اسی طرح مسلمان کو بھی اپنے اندر شان بے نیازی پیدا کرنے چاہئے۔ جس طرح خدا مادی علائق سے پاک ہے، اسی طرح ملتِ اسلامیہ کو بھی وطن، نسب، رنگ اور نسل کے امتیازات سے بالاتر ہونا چاہئے۔ جس طرح اللہ

تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں ہے اسی طرح ملتِ اسلامیہ کو بھی
ایسی سربلندی حاصل کرنی چاہئے کہ کوئی قوم اس کی
ہمسر کا دعویٰ نہ کر سکے۔''[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اقبالؔ نے پہلی اور دوسری صفت کو فرد سے اور تیسری اور چوتھی صفت کو ملت سے متعلق کیا ہے۔

بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پروفیسر صاحب نے اس کتاب کی شرح کرتے ہوئے ہر اس نکتہ کا خلاصہ درج کیا ہے جو اس مثنوی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور جب قاری اس کا مطالعہ کرتا ہے تو ذرا بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اقبالؔ کے فارسی کلام کا مطالعہ کر رہا ہے۔

اقبالؔ نے اپنی تصانیف میں سے صرف دو کتابوں پر دیباچہ لکھا ایک ''اسرارِ خودی'' اور دوسری ''پیامِ مشرق'' ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کی نظر میں یہی دو کتابیں ایسی ہیں کہ وہ خود ناظرین سے ان کو متعارف کرائیں۔ اقبالؔ نے موضر الذکر کتاب مشہور جرمن حکیم گوئٹے کی غیر فانی تصنیف ''مغربی دیوان'' کے

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی رموزِ بیخودی مع شرح۔ ص ۔ 355

جواب میں لکھی ہے۔

پیام مشرق کا دیباچہ بہت پُر مغز اور بصیرت افروز ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب نے اس فارسی مجموع کی شرح سے پہلے اقبال کا تحریر کیا ہوا دیباچہ نقل کیا ہے۔ تاکہ قائیرین پر اس کی اہمیت واضح ہو سکے۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

> ''پیام مشرق کا محرک گوئٹے کا دیوان ہے اور اس کا مدّعا اور مقصد ان اخلاقی، ملّی اور مذہبی حقائق کو پیش کرنا ہے جن کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے''[1]

علّامہ اقبال نے ''پیام مشرق میں مشرق'' اور مغرب دونوں کو عشق کا پیغام دیا ہے۔ یہ کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ لالۂ طور میں رباعیات درج ہیں' ان میں فلسفہ کے مسائل نظم کئے ہیں۔ ان مسائل میں وحدت الوجود کا مسئلہ سب سے زیادہ مشکل ہے۔

دوسرے حصے کا عنوان افکار ہے۔ اقبال نے ان حصے میں

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 10

خدا، انسان اور کائنات سے متعلق مسائل شاعرانہ انداز میں پیش کئے ہیں جن کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو کسی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔

تیسرا حصّہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس حصے کو پروفیسر صاحب کتاب کا دلکش ترین حصہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ حصّہ اس کتاب کا سب سے زیادہ دل کش حصہ ہے اور میرا قیاس یہ ہے کہ اگر یہ حصّہ اس کتاب میں شامل نہ ہوتا تو شاید یہ کتاب دو یا تین مرتبہ سے زیادہ شائع نہ ہوتی۔"[1]

ان غزلیات پر فارسی کے اکابر شعراء کے اثرات کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر صاحب اقبالؔ کی انفرادیت کا بھی ذکر کرتے ہیں:۔

"ان غزلوں کی زبان اور انداز بیان میں حافظؔ اور نظیریؔ کا رنگ جھلکتا ہے اور ان کے مضامین میں بیدلؔ اور غالبؔ کی سی بلندی نظر آتی ہے۔ لیکن شاعر کی انفرادیت ہر غزل

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 8

سے نمایاں ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبالؔ نے خود
غزلوں میں بھی جا بجا اپنے مخصوص فلسفۂ حیات کی
تبلیغ کی ہے۔''[1]

اس کتاب کا چوتھا حصّہ جسے انھوں نے'' نقشِ فرنگ'' سے تعبیر کیا ہے۔حکمائے مغرب کے افکار پر تنقید ہے۔ پانچواں حصّہ جس کا عنوان خردہ ہے، اس میں انھوں نے چند قطعات اور چند متفرق اشعار درج کئے ہیں۔

علّامہ اقبالؔ نے پیام مشرق کے کلام کی ابتداء ایک'' پیش کش'' سے کی ہے۔جو سات بندوں پر مشتمل ہے۔ پروفیسر صاحب اس پیش کش کا تجزیہ کرنے سے پہلے تمہید پیش کی ہے۔ جو اس'' پیش کش'' کے حقائق کو بخوبی واضح کر دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

''جب امیر امان اللہ خان اپنے والد کے قتل کے بعد تخت
نشین ہوئے اور انھوں نے پہلے کام یہ کیا کہ انگریزوں کے
خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ افغانستان کی
خارجی سیاست انگریزوں کے زیر اثر تھی اور امیر موصوف

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 8

اسے بالواسطہ غلامی تصور کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں رولٹ ایکٹ کی بناء پر سارے ہندوستان میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے پہلے معرکہ میں شکست کھا جانے کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ افغانستان سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد راولپنڈی میں صلح نامہ مرتب ہوا۔ جس کی رو سے برطانیہ نے افغانستان کی آزادی تسلیم کر لی''[1]

آزادی حاصل کرنے کے بعد امیر امان اللہ خان نے ملکی اور قومی اصطلاحات کی طرف توجہ کی اور اس معاملے میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اس لئے اقبالؔ نے ان کی ذات سے بہت کچھ توقعات وابستہ کر لیں اور اپنی اس مایہ ناز تصنیف کو ان کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔

اقبالؔ نے اس ''پیش کش'' میں کمال دلسوزی اور اخلاص کے ساتھ ملّی، مذہبی اور سیاسی ترقی کا پروگرام مرتب کر کے امیر موصوف کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ لیکن امیر امان اللہ خان کی

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 20

شکست سے پروفیسر صاحب نے یہ قیاس کرلیا ہے کہ موصوف نے اقبالؔ کی خلوص اور دلسوزی کے ساتھ تحریر کی گئی اس پیشکش کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

''میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کو مدِ نظر رکھتے تو اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجاتے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی'' [1]

یہ پیش کش سات بندوں پر مشتمل ہے، پہلے بند میں اپنا مدعا یوں بیان کیا ہے:۔

اے امیرِ کامگار اے شہریار
نوجوان و مثلِ پیراں پختہ کار
عزمِ تو پائندہ چون کہسارِ تو
حزمِ تو آسان کند دشوارِ تو
اے امیر، ابنِ امیر، ابنِ امیر
ہدیۂ از بنیوائے ہم پزیر!

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 21

کہ اے امیر! تو اگر نوجوان ہے لیکن بوڑھوں کی طرح سمجھ دار ہے۔ تیری ذہانت، تری دانائی، عزم و ہمت بلا شبہ لائق تحسین ہیں۔ تیرے خزانے میں کسی شئے کی کمی نہیں ہے۔ آئے دن ترے پاس بادشاہوں کی طرف سے تحفے آتے رہتے ہیں اسلئے تو ہدایا کا آرزو مند نہیں ہے۔ لیکن ایک ہدیہ مجھ فقیر بے نوا کی طرف سے بھی قبول کر لے۔

دوسرے بند میں اقبالؔ اپنا موازنہ گوئٹے سے کرنے کے بعد اپنی قوم کی کوتاہ نظری پر یوں شکوہ سنج ہیں۔

لالہ و گل از نوایم بے نصیب
طائرم در گلستانِ خود غریب!
بسکہ گردون سفلہ ودوں پرور است
دائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

پروفیسر صاحب اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں (اقبالؔ) اپنی قوم کو دنیا میں سروری حاصل کرنے کا طریقہ بتاتا ہوں۔ لیکن وہ مجھ سے شاعری کی توقع

رکھتی ہے۔ مسلمان رمزِ حیات سیکھنے کے بجائے مجھ سے
شعر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں! حقیقتِ حال یہ ہے کہ
اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو دین اور سیاست
کے اسرار سے آگاہ فرمایا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ
غیر معمولی علم و فضل کے باوجود مجھے ہندوستان میں پیدا کیا
جہاں کوئی میرا راز داں نہیں۔ اسی جذبہ کو ضربِ کلیم میں یوں
ظاہر کیا ہے ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

یعنی میں اپنی قوم میں اجنبی شخص کی طرح رہتا ہوں،
کوئی شخص مجھ سے آگاہ نہیں ہے۔" [1]

علّامہ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے سے مسلمان قوم کو عشق رسولؐ ہی سے زندگی کی سربلندی حاصل کرنے کا پیغام دیا ہے۔ چنانچہ اس "پیش کش" میں بھی علامہ اسی جذبہ کو دہرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 24 - 25

سروری در دینِ ما خدمت گری است　　عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است
ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامان اوست　　بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
خیز و اندر گردش آور جامِ عشق
در قہستان تازہ کن پیغامِ عشق

یعنی اے امیر! اس بات کو مدنظر رکھتے کہ اسلام میں سرداری کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کا سردار ہو۔ وہ ان کی خدمت کرے۔ اگر مسلمانوں کے امیر میں فاروقؓ کا سا عدل اور حیدرؓ کا سا فقر نہ ہو تو اسلام کی رو سے وہ حکومت کا اہل نہیں ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب نے اس خیال کی وضاحت اس تفصیل کے ساتھ کی ہے کہ اس کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ ان اشعار کے ذریعے سے کیا پیغام ہمیں دینا چاہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب اسی ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ جن بادشاہوں نے دنیائے اسلام میں عزت (امیری) حاصل کی ہے۔ ان سبھوں نے بادشاہت کے پردے میں درویشی کی ہے۔ مثلاً "سلطان نورالدین

زنگی" سلطان محمود بیگڑہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر اور سلطان
ٹیپو شہید۔ ان سبھوں کی زندگی میں حکومت کے ساتھ ساتھ
فقر کی شان جلوہ گر تھی۔ ان کی زندگی کی کائنات صرف دو
چیزیں تھیں قرآن اور تلوار۔" [1]

پروفیسر چشتی صاحب نے اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کی شرح کرتے ہوئے قرآن اور حدیث کا حوالہ دیا ہے، پیام مشرق میں بھی ایسی عمدہ مثالیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جن میں یہ مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر حصہ لالہ طور کی یہ رباعی ؎

مرا فرمود پیرِ نکتہ دانے
ہر امروزِ تو از فردا پیام است
دل از خوبانِ بے پروا نگہدار
حریمش جز باو دادن حرام است

پروفیسر صاحب اس رباعی کی شرح سے پہلے ہمیں اس کے بنیادی تصور سے آشنا کراتے ہیں کہ ذہن میں غیر اللہ کو جگہ دینا گناہِ

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 32 - 33

عظیم بلکہ نا قابلِ معافی جرم ہے۔' اس کے بعد اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''مجھے ایک عارفِ کامل نے یہ نکتہ سمجھایا، کہ ترا اہر امروز (آج) فردا مستقبل) کا آئینہ دار (پیام بر) ہے۔ یعنی اگر تو آج کوئی قدم غلط اٹھائے گا۔ تو کل کو اس کا خمیازہ بھگتنا لازمی ہے۔ بالفاظِ دیگر تری آئندہ زندگی برباد ہو جائے گی۔ لہذا اگر تو اپنی آئندہ زندگی کو سنوارنا چاہتا ہے تو غیر اللہ سے دل مت لگا۔ ان کے خیال کو اپنے دل میں جگہ مت دے کیونکہ دل تو اللہ کا گھر ہے، اس میں غیر اللہ (زن، زَر، زمین) کا گزر کیسے اور کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ اگر تو اس کے حریم کو غیر اللہ کے حوالے کر دے گا۔ تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرِكَ بِهٖ "

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے بندو! مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کو چھوڑ کر غیر سے محبت کرنے لگے تو بلا شبہ وہ مشرک ہے اور مشرک کی بخشش ہر گز نہیں ہوگی۔'' [1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص 130 - 131

پروفیسر صاحب اس رباعی میں ''خوبان بے پروا'' کی ترکیب کی بڑے دل کش انداز میں وضاحت کرتے ہیں لکھتے ہیں:۔

''اقبالؔ نے ''بے پروا'' کی قید لگا کر ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ عورتیں (خوبانِ عالم) عاشق کے خلوص کی قدر نہیں کرتیں۔ بلکہ اس کی جانب سے بے پروائی کا اظہار کرتی ہیں۔ چونکہ ان کا زوایۂ نگاہ سراسر مادی ہوتا ہے۔ اس لئے عاشق کے اظہار تمنا سے ان کی خود بینی میں اور بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن دولت کو دیکھ کر بلا تامل سپر انداز ہو جاتی ہیں۔ حسرتؔ موہانی نے کیا خوب لکھا ہے۔

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا [1]

چشتی صاحب کلام اِقبالؔ کی شرح میں کسی بھی نظم یا غزل کے بنیادی تصور پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض اوقات شعر کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے شعراء کے اشعار کا حوالہ دیتے ہیں۔ تا کہ مفہوم سمجھنے میں

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 131

آسانی ہو اکثر مقامات پر خود علاّمہ اقبالؔ کے اُردو اشعار کا ہی حوالہ دیتے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں اکثر و بیشتر اُن کے فارسی کلام کی شرح کے دوران ملتی ہیں۔ اِس بات کے ثبوت میں پیام مشرق کے حصۂ دوم کی نظم ''دعا'' پیش کی جاسکتی ہے۔

اے کہ از خم خانۂ فطرت بجاحم ریختی
زآتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز از گرمئی فریادِ من
شعلۂ بیباک گرداں خاکِ سینائے مرا
چون بمیرم از غبارِ من چراغِ لالہ ساز
تازہ کن داغِ مرا، سوزان بصحرائے مرا

یہ ایک فلسفیانہ اور بلند پایہ نظم ہے۔ اس میں شاعر نے مادیات اور زندگی کے بنیادی لوازمات سے بلاتر ہوکر، مقصدِ ہستی کے حصول کی دُعا کی ہے۔ انسان عام طور پر یہ دُعا مانگتا ہے کہ اے خُدا مجھے دنیا میں عورت، دولت، حکومت اور مرنے کے بعد جنت عطا کر! لیکن اقبالؔ اس نظم میں کچھ اور ہی دُعا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہ اللہ میرے قلب کو غیر اللہ کی محبت سے خالی کردے

تا کہ دنیا والوں کی نگاہ میں عشق حقیقی کا صحیح مقام واضح کر سکوں جیسا کہ پروفیسر چشتی صاحب لکھتے ہیں۔

''اے خدا! تو نے اپنے فضل وکرم سے میرے قلب کو عشق سے معمور کر دیا ہے۔ اس عشق (صہبا) کی آگ میں میری شخصیت (مینا) کو جلا کر خاکستر کر دے یعنی میرے قلب کو غیر اللہ کی محبت سے یکسر خالی کر دے۔ میری گرمئی فریاد کو عشق کے لئے سرمایہ بنا دے یعنی میری عاشقانہ زندگی کی بدولت عشقِ حقیقی کا صحیح مقام اور اس کی قدر و منزلت دنیا والوں کی نگاہ میں واضح کر دے۔ نیز اس عشق کی تاثیر سے میری ہستی (خاکِ سینا) کو باطل کے حق میں سراپا آتش بنا دے'' [1]

اس کے بعد پروفیسر صاحب اسی بات کو علّامہ کے اس شعر سے موزوں کر دیتے ہیں کہ اقبالؔ نے مسلمانوں کو شعلہ بننے کی تلقین کی ہے۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا؟ کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 256

آخری شعر کی شرح میں پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

''اے خدا! میں چاہتا ہوں کہ میری وفات کے بعد میرے مزار کی خاک سے گل لالہ پیدا ہوں۔ تا کی اس طرح میرا داغِ جگر (نشانِ عشق) دنیا میں از سرِ نو جلوہ گر ہو سکے۔ اور زبانِ حال سے دُنیا والوں کو عشق کا پیغام دے سکے۔'' [1]

پیامِ مشرق کی ہی ایک نظم ''ساقی نامہ'' جو انھوں نے نشاط باغ کشمیر میں بیٹھ کر لکھی تھی، میں بھی علّامہ اقبالؔ نے اللہ (ساقی) سے دعا کی ہے کہ باشندگانِ کشمیر کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کر دے۔ تا کہ وہ بھی اس دنیا میں عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس نظم کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ علّامہ کو کشمیر اور باشندگانِ کشمیر سے کس قدر محبت تھی جس کا اظہار انھوں نے جا بجا اپنے کلام میں کیا ہے۔ اس نظم کی تشبیب میں علّامہ نے بہار کا منظر پیش کیا ہے۔

خوشا روزگارے، خوشا نو بہارے
نجوم پرن رُست از مرغزارے

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 256

یعنی بہار کا موسم کس قدر دلفریب ہے۔ باغ کی جانب نظر کرو، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف ستارے اگ رہے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے نظم کی شرح کرتے ہوئے مشکل الفاظ کے معانی بھی درج کئے ہیں تا کہ قاری کو کوئی بھی مشکل پیش نہ آئے۔ مثال کے طور پر مزکورہ شعر میں ''نجوم پرن'' استعمال ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس کے معانی کی تشریح کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ نجوم پرن سے خوشۂ پروین یعنی ستاروں کا مجموعہ مراد ہے۔

چشتی صاحب نے نظم ''ساقی نامہ'' کی شرح کرتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے اور اس طرح سے شعر کی تشریح کی ہے کہ مطلب کے ساتھ ساتھ تاریخ کی بھی نشاندہی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ''ساقی نامہ'' کا یہ شعر۔

سرت گردم اے ساقی ماہ سیما
بیا راز نیا گانِ ما یادگارے

شاعر ساقی (اللہ) سے دُعا گو ہے کہ اے ساقی ہمارے دلوں میں اُن بزرگوں کی یاد از سرِ نو تازہ کر دے جنھوں نے کفر ستانِ کشمیر میں توحید کی شمع روشن کی تھی۔ یعنی ہمیں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ علاّمہ اقبالؔ نے مذکررہ شعر میں جن بزرگوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور ان کے رفقاءؒ ہیں جن کی بدولت کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

> ''اشارہ ہے امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانیؒ اور حضرت سید محمد میرک اندرابیؒ اور ان کے رفقائے کار کی طرف جن کی تبلیغی کوششوں کی بدولت آج کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی اسی فیصدی سے بھی زیادہ ہے۔''[1]

اس کے بعد علاّمہ اقبالؔ اہل کشمیر کے حق میں دُعا کرتے ہیں کہ اے خدا! آج کشمیر کا مسلمان اپنے دین سے بے گانہ ہو چکا ہے اور غلامی نے اس کی فطرت ایسی مسخ کر دی

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 333

ہے کہ اس نے ہر سنگ مزار کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

کشمیری کہ با بندگی خود گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگِ مزارے

اور اس بُت پرستی یا قبر پرستی کا اصلی سبب یہ ہے کہ کشمیری عوام ایک عرصہ سے غلامی میں مبتلا ہیں۔

از ان مَے فشان قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اے خدا اس شراب سے یعنی جزبۂ حریت سے کشمیر کے موجودہ مسلمانوں کو بھی سرشار کر دے، تا کہ وہ حریت کی نعمت سے مالا مال ہوسکیں۔

ہر وہ شخص جس نے کلامِ اقبالؔ کا مطالعہ کیا ہے، اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اقبالؔ فلسفی ہونے کے علاوہ شاعر

بھی ہیں ۔ ان کے فلسفہ سے کہیں کہیں اختلاف کرنا ممکن ہے ،لیکن ان کی شاعرانہ عظمت ہر شخص کے نزدیک مُسلّم ہے ۔

اصنافِ شاعری میں غزل سب سے زیادہ دل کش اور مقبول صنف ہے کیونکہ شاعر اپنے وارداتِ قلبی اور جذباتِ عاشقی کے اظہار کا ذریعہ غزل کو ہی بناتا ہے ۔ اگر چہ علاّمہ کی شاعرانہ عظمت کا دار و مدار ان کی غیر فانی نظموں پر ہے، لیکن غزل میں بھی ان کا مرتبہ کسی سے کم نہیں ہے ۔ پیامِ مشرق میں حصّہ غزلیات کو انھوں نے '' مئے باقی '' کے نام سے موسوم کیا ہے اور ان غزلوں کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؔ نے حافظؔ اور نظیریؔ کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا ہے ۔ ان غزلوں کی شرح کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے آسان لغات کے معانی درج نہیں کیئے ہیں البتہ مشکل اشعار کی وضاحت اس انداز سے کی ہے کہ قاری کلام اور پیغام دونون کی روح سے آشنا ہوسکیں لکھتے ہیں :۔

۱پروفیسر یوسف سلیم چستی شرح دیوان غالب ص ۲

''میں نے ان غزلوں کی شرح میں آسان لغات کے معانی درج نہیں کئے ہیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ ''پیام مشرق'' کے پڑھنے والوں کو فارسی مصادر اور آسان فارسی الفاظ مثلاً گل، برگ، زندہ دل، خاکِ ہند، نوا، خلوت، حجاب، ناتمام، تغافل وغیرہ کے معانی ضرور معلوم ہوں گے، میں نے آسان اشعار کا مطلب بہت مختصر لکھا ہے لیکن مشکل اشعار کی وضاحت میں کوئی دقیقہ فردوگذاشت نہیں کیا ہے۔ شرح اس انداز سے کی ہے کہ پڑھنے والے کلام اور پیغام دونوں کی روح سے آشنا ہوسکیں اور یہ وہ مقصد ہے جو میں نے اقبالؔ کی تمام کتابوں کی شرح میں پیش نظر رکھا ہے۔'' [1]

پروفیسر صاحب نے کہیں کہیں غزلوں کی تشریح کے دوران اردو اشعار کا بھی حوالہ دیا ہے مثال کے طور پر غزل نمبر (۴) کا تیسرا شعر۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی پیامِ مشرق مع شرح۔ ص ۔ 430

نوازنیم و بہ بزم بہار می سوزیم
شرر بہ مشتِ پر ما زنالۂ سحر است

یعنی اگر تم دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنا چاہتے ہو۔ بالفاظِ دگر اقوام عالم میں سربلندی کے طالب ہو تو عشق الہیٰ (نالہ سحر) اختیار کرو۔ اس عشق کی بدولت تمہاری شخصیت سراپا آتش بن جائے گی۔ یعنی تمہارے اندر بے اندازہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ اسی مضمون کو علّامہ نے یوں بھی بیان کیا ہے۔

عطارؒ ہو رومیؒ ہو رازیؒ ہو غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

بعض مقامات پر چشتی صاحب نے اشعار کی شرح میں اختصار سے کام لیا۔ مثال کے طور پر غزل نمبر ۱۸ کا آٹھواں شعر۔

مرید ہمت آں رہروم کہ پا نگذاشت
بہ جادۂ کہ در و کوہ و دشت و دریا نیست

یعنی خودی مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے سے پختہ ہوسکتی ہے اسلئے قابل تحسین وہ سالک ہے جو اس راہ پر چلتا ہے جس میں قدم قدم پر مشکلات لاحق ہوں۔

پروفیسر صاحب اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ شعر قاری کے ذہن نشین ہو صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی یہ بھی کوشش رہتی ہے کہ قاری کے ذہن پر اس کے گہرے نقوش قائم ہوں۔

اقبال کی فکر میں مشاہدات، مطالعات اور غور وفکر کے نتیجے میں بتدریج ارتقاء ہوتا رہا۔ انھوں نے دقیق خیالات کے اظہار کے لئے فارسی زبان کو اپنایا۔ اُردو سے فارسی کی طرف رجوع کرنے کے باعث بھی اقبال کے کلام کو سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ تاہم یہ پروفیسر چشتی صاحب کی ذات کا فیض ہے کہ انھوں نے اردو دان طبقے کے لئے اقبال کے فارسی کلام کو قابل فہم بنایا ہے۔

زبور کے اصطلاحی معنی ہیں وہ الہامی کتاب جو حضرت داؤد پر نازل ہوئی تھی۔ عارفانہ یا حکیمانہ کلام کو بھی مجازاً الہام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی کتاب کو ''زبور'' سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ نے یہ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ اس لئے بجا طور پر اس کا نام ''زبورِ عجم'' رکھا ہے۔ یعنی وہ زبور جو عجمی (فارسی) زبان میں ہے۔ اقبال نے سب سے پہلے اس کتاب کی ترتیب میں پڑھنے والوں کو ایک نصیحت کی ہے ''بخوانندۂ کتاب زبور''۔

می شود پردۂ چشم پرکاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے
وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
در طلب کوش و مدہ دامن امید از دست
دولتے ہست کہ پابی سرراہے گاہے!

تین شعروں کی اس نظم میں اقبالؔ پڑھنے والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کراتے ہیں کہ انسان بہت ضعیف ہے اس لئے جب تک فضل الہیٰ شامل حال نہ ہو، محض اپنی کوشش سے کامیاب ہونا ممکن نہیں۔ پروفیسر صاحب اس کتاب کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''میری رائے میں ''زبورِعجم'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ علّامہ کو اپنی امن تصنیف پر بڑا ناز تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اہلِ ذوق سے اس کتاب کے مطالعہ کی خود سفارش کی ہے۔ چنانچہ بالِ جبرئل میں لکھتے ہیں۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِعجم
فغانِ نیم شبِ بے نوائے راز نہیں۔'' [1]

اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ نے یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لئے لکھی ہے جو عارفانہ مذاق رکھتے ہیں کیونکہ اس کی تمام غزلیں نغمات عشق و محبت سے معمور

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی زبورِعجم مع شرح ۔ ص ۔ 6

ہیں۔ اقبالؔ نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پروفیسر صاحب ان حصوں کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

''پہلے حصے کی شروعات ایک شعر سے ہوتی ہے اس کے بعد نظم کا آغاز ہوتا ہے، اس نظم میں اللہ تعالیٰ کی حمد کی گئی ہے۔ اس کے بعد چند غزلیات درج ہیں۔ زبورِعجم کے دوسرے حصے میں انسان سے خطاب کیا گیا ہے۔ ''زبورعجم'' کے اختتام پر علّامہ اقبالؔ نے چند غزلیات اور درج کی ہیں۔ اور دوسری کتاب کی ابتداء ہوتی ہے جس کا نام ''گلشنِ راز جدید'' ہے۔ اس کے بعد تیسری کتاب ''بندگی نامہ'' شروع ہوتی ہے۔ اس میں چار فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں غلامی کے مقاسد بیان کئے ہیں۔ دوسری فصل میں غلاموں کے فنونِ لطیفہ کا تذکرہ ہے۔ تیسری فصل میں ان کے مذہب کی تصویر پیش کی ہے۔ آخری فصل میں ''مرادنِ آزاد'' کے فنِ تعمیر پر تبصرہ کیا ہے۔'' [1]

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی زبورعجم مع شرح۔ ص ۔ 6

پروفیسر صاحب نے اس کتاب کی شرح کرتے ہوئے حسب روایت قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے مثال کے طور پر حصۂ دوم کی غزل ۴۶ کا یہ شعر

ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق
جز انیکہ منکرِ عشق است کافر و زندیق!

یعنی شریعتِ اسلامیہ کی روح یہ ہے کہ مسلمان، اس وقت حقیقی معنوں میں مسلمان بنتا ہے جب وہ مسلکِ عشق اختیار کرے۔ پروفیسر صاحب کے خیال سے یہ مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

جو لوگ مومن ہیں انھیں سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص عاشق نہیں ہے وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

علّامہ اقبالؔ نے ''زبورِعجم'' میں ابتداء سے لے کر آخر تک عشق و مستی کے اسرار کو واضح کیا ہے۔ مثلاً

عشق را بادۂ مرد افگن و پُر زور بدہ
لالے ایں بادہ بہ پیمانۂ ادراک انداز

یعنی صرف عاشق ہی اللہ کی محبت کی تیز شراب پی سکتا ہے۔ جو لوگ عقل کی پیروی کرتے ہیں ان کا ظرف اس کی تیزی برداشت نہیں کر سکتا، اس لئے انہیں اس کی تلچھٹ ہی کافی ہے۔

پروفیسر چشتی صاحب نے اس کتاب میں شامل غزلیں اور نظمیں دونوں کے اشعار کی الگ الگ تشریح کی ہے۔ مثلاً

بنی جہاں را خود را نہ بینی
تا چند ناداں غافل نشینی!
نورِ قدیمی شب را برافروز
دست کلیمی در آستینی!
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق

تو پیش از نی تو بیش از نی !
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید
مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی
صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

پروفیسر صاحب اس کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ یہ زبورِ عجم کی بہترین غزلوں میں سے ہے۔ اس میں اقبالؔ نے انسان کو اس کے ذاتی شرف سے آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اگر وہ اپنے اندر یقین پیدا کر لے، تو اسے حیاتِ جاوید حاصل ہو سکتی ہے۔ مذکورہ صدر غزل کی شرح کی تفصیل پروفیسر چستی صاحب کے الفاظ میں ہی ملاحظہ کیجئے:۔

"(۱) اے انسان! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تو ساری کائنات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے لیکن کبھی مشاہدہ باطن کی

طرف متوجہ نہیں ہوتا! تو کب تک غفلت میں اپنی زندگی کھوتا رہے گا؟ (۲) تو اپنے آپ کو مادی سمجھتا ہے حالانکہ دراصل تو نور قدیم (ذات حق) کا پرتو ہے۔ اس لئے تو اپنی زندگی کو منور کرنے کی کوشش کر۔ اگر تو اپنی خودی کا مشاہدہ کرے، تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیرے اندر محیر العقول طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ (۳) اپنی اصل کے لحاظ سے تو اس کائنات سے برتر اور مقدم (پیش) ہے۔ اور اپنی وسعت کے اعتبار سے اس سے وسیع تر ہے۔

؎ مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(۴) اے انسان! تو کائنات کی طرح فانی نہیں ہے بلکہ باقی ہے اس لئے موت سے ڈرنا سراسر نادانی ہے۔ اگر تو اپنی خودی کو پختہ کر لے تو موت تجھے فنا نہیں کر سکتی۔ (۵) حق تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنی عطا کردہ نعمت واپس نہیں لیا کرتا۔ لہذا جو زندگی (روح) تجھے عطا فرمائی ہے وہ تجھ سے واپس نہیں لے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر تو اپنے اندر ایمان کی صفت پیدا نہیں کرے گا تو بے شک فنا ہو جائے گا۔

(۶) اے مخاطب! تو مجھ سے خودی کی تربیت کا طریقہ ضرور سیکھ لے۔ شاید کبھی ترے دل میں خودی کو مرتبہ کمال تک پہنچا کر نئی زندگی حاصل کرنے کی خواہش موجزن ہو جائے۔ اس وقت صورت گری کا فن ترے کام آجائے گا۔'' [1]

پروفیسر چشتی نے کلام اِقبال کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے اُس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

''ان کے پیغام کا مقصود اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان ''بازآفرینی'' کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ انھوں نے مسافر میں اسی ''بازآفریدن'' کو ''بازیافتن'' سے تعبیر کیا ہے۔

اے زخود پوشیدہ، خود را بازیاب
در مسلمانی حرام است ایں حجاب'' [2]

علّامہ اقبالؔ کی تصانیف (فارسی اور اردو) کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ انقلاب کے متمنی تھے۔ اقبالؔ کی خواہش تھی کہ مسلمان پہلے اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی زبورِعجم مع شرح۔ ص ۔321

[2] پروفیسر یوسف سلیم چشتی زبورِعجم مع شرح۔ ص ۔322

کریں، اس کے بعد ہی وہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی ہر تصنیف میں انقلاب کا درس دیا ہے۔ اس کا اندازہ ''زبورِ عجم'' کی آخری غزل سے بخوبی ہوتا ہے جس کا مطلع اس انقلاب کی عکاسی کرتا ہے ؎

خود را کنم سجودے' دیر و حرم نماندہ
ایں در عرب نماندہ' آں در عجم نماندہ

یعنی نہ دیر میں کوئی بُت لائق سجدہ نظر آتا ہے نہ حرم میں کوئی اللہ کا بندہ اس قابل ہے کہ اس کی اتّباع کی جائے۔ اس لئے اب میں مجبوراً اپنے آپ کو سجدہ کیا کروں گا۔

چشتی صاحب مذکورہ غزل کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''علّامہ اقبالؔ نے اس غزل میں پوری کتاب کی روح کھینچ کر رکھ دی ہے۔ دراصل اقبالؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے انسان اپنے اندر انقلاب پیدا کرے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرے گا۔ چونکہ

مسلمان اس قانون سے بے گانہ ہو چکے ہیں' اس لئے
اپنے اندر انقلاب تو پیدا نہیں کرتے' بس رات دن انقلاب
کے لئے دُعا کرتے رہتے ہیں۔ کاش یہ حقیقت ان پر منکشف
ہو جاتی کہ جب تک قبولیت دُعا کی شرائط پوری نہ ہوں' کوئی
دُعا قبول نہیں ہوتی۔''[1]

''گلشنِ راز جدید'' بلاشبہ اقبالؔ کی تمام تصانیف میں منفرد حثیت رکھتی ہے۔ علّامہ اقبالؔ نے یہ تصنیف شیخ محمود شبستریؒ کی مہشور کتاب ''گلشنِ راز'' کے جواب میں لکھی ہے۔ شیخ کی یہ تصنیف علم تصوف میں بہت مستند کتاب سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں اربابِ علم و دانش نے اس کتاب (گلشنِ راز) سے اِستفادہ کیا ہے۔ ''گلشنِ راز'' کی طرح اقبالؔ کی ''گلشنِ راز جدید'' میں بھی کہیں شاعری کا رنگ نہیں ہے بلکہ یہ خالص فلسفۂ تصوف کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔ ''گلشنِ راز جدید'' علّامہ اقبالؔ نے خاص طور سے ان لوگوں کے لئے لکھی ہے جو اپنی کم علمی یا ناواقفیت کی بناء پر اسلامی نظریہ وحدۃ الوجود میں فرق نہیں کر پاتے ہیں اور اس لئے اس کے ثمرات سے محروم رہتے ہیں۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی زبورِ عجم مع شرح۔ ص۔ 385

شیخ موصوف نے جس مسلک کی تبلیغ ''گلشنِ راز'' میں کی ہے وہ اسلام کی روح سے مطابقت رکھتا ہے۔ ''گلشنِ راز'' فلسفہ اور تصوف سے پیدا شدہ منظوم سوال و جواب پر مشتمل ہے۔ پروفیسر صاحب اس تصنیف (گلشنِ راز) کے لکھنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''تصنیف لکھنے کا سبب یہ تھا کہ ۱۳۱۷ء میں ہرات کے ایک علم دوست بزرگ میر حسین ابن حسن میر سادات حسینی نے خراسان سے سترہ سوالات علمائے تبریز کی خدمت میں روانہ کئے تھے۔ انھوں نے شیخ موصوف سے ان کے جوابات لکھنے کی درخواست کی چنانچہ شیخ نے بیک نشست ان کے جوابات لکھ دیئے۔ مرورِ ایام سے آخری دو سوال اور ان کے جواب تلف ہو گئے اس لئے مطبوعہ نسخوں میں عموماً پندرہ سوالات ملتے ہیں۔'' [۱]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علّامہ اقبالؔ نے ''گلشنِ راز'' کا جواب کیوں لکھا؟ علّامہ وحدۃ الوجود کے حامی اور قائل رہے ہیں جیسا کہ بانگِ درا کی نظموں سے ظاہر ہے۔ علّامہ نے جس طرح

---

[۱] پروفیسر یوسف سلیم چشتی زبورِ عجم مع شرح۔ ص - 388

وحدۃ الوجود کی اسلامی تعبیر کی تبلیغ کی ہے' اسی طرح اس نظریہ کی غیر اسلامی تعبیر کی تردید بھی کی ہے' جس کی رُو سے انسان کا مقصدّ حیات یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو خدا کی ذات میں اس طرح گم (فناء) کردے کہ اس کا وجود باقی نہ رہے۔ یعنی قطرہ سمندر میں مل کر سمندر بن جائے۔ اس سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ انھوں نے ''گلشنِ راز'' کا جواب کیوں لکھا ہے۔ اقبالؔ کا مقصدّ یہ ہے کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ وحدۃ الوجود کا غیر اسلامی نظریہ قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیمات کے یکسر خلاف ہے اس لئے اس سے اجتناب لازم ہے۔

پروفیسر صاحب نے ''گلشنِ راز جدید'' کی شرح کرتے ہوئے اپنا زورِ قلم آزمایا ہے۔ چشتی صاحب نے پہلے' سوالات کی شرح پیش کی ہے اور اس کے بعد اقبالؔ کے جوابات کی وضاحت نہایت ہی خوبی کے ساتھ بیان کئے ہیں اور اکثر وبشتر اردو اشعار کا حوالہ درج کر کے شعر کے مفہوم کو آسان طریقے سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ شعر۔

سفر اندر حضر کردن چنسین است
سفر از خود بخود کردن ہمین است

اس سفر میں زمان ومکان کو دخل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سالک اپنے سفر میں ترقی کرتا ہے تو اس کی نگاہ میں اطلاقیت کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ یعنی اسے ہر مقید میں مطلق کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ اسی بات کو اقبالؔ نے آفاقیت سے بھی تعبیر کیا ہے

؎

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

اقبالؔ چونکہ مسلک وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور اس کے مبلغ بھی ہیں، ''گلشنِ راز جدید'' میں اقبالؔ اسی مسلک کے ''ان تھک مفسر'' نظر آتے ہیں۔ یہ ساری کتاب اسی مسلک کی فلسفیانہ تعبیر ہے۔ علامہ اقبالؔ جس فکر کے پیرو ہیں اس فکر کی بنیاد قرآن و احادیث پر مبنی ہے۔ اسلئے علامہ شیخ اکبرؒ کو اسلامی نظریہ وحدۃ الوجود کے سب بڑے شارح تسلیم کرتے ہیں۔ ''گلشنِ راز

جدید'' کی تمہید سے پہلے علاّمہ نے چند اشعار درج کئے ہیں جس میں اقبالؔ یہ پیغام دیتے ہیں کہ مسلمان اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کریں اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔

''بہ سوادِ دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من
بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من
ہمہ خاوراں بخوابے کہ نہاں ز چشمِ انجم
بہ سرودِ زندگانی سحر آفریدہ ام من

یعنی مشرقی اقوام بالخصوص مسلمان' زندگی کی ماہیت اور اپنی تخلیق کی غایت سے آگاہ ہو جائیں گے، تو ان کے ضمیر میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اس وقت تمام مشرقی قومیں خواب غفلت میں پڑی ہوئی تھیں۔ اقبالؔ نے انہیں پیغام حیات دیا ہے۔ تاکہ وہ اس خواب غفلت سے بیدار ہو کر دنیا میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے کلام اقبالؔ سے بہت کم فائدہ حاصل کیا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ فارسی زبان وادب سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اگر قرآن کی رُو سے دیکھا جائے تو مسلمان کے لئے زندگی بسر کرنے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ غیر اللہ کی غلامی سے آزاد رہ کر زندگی بسر کرے یا اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے غیر اللہ سے جنگ کرے۔ چونکہ مسلمان اس صداقت سے محروم ہو چکے ہیں اور صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے علاّمہ نے ''بندگی نامہ''[1] مسلمانوں کو غلامی کے مفاسد سے آگاہ کیا ہے تاکہ وہ آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ ''بندگی نامہ'' میں اقبالؔ نے پہلے تمہید درج کی ہے چشتی صاحب نے اس تمہید کی شرح میں نہایت اختصار سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد علاّمہ نے غلام قوموں کے فنونِ لطیفہ پر تبصرہ کیا ہے۔

یعنی '' بندگی نامہ'' میں اقبالؔ نے جس پیغام کو قوم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ غلامی کی زندگی بسر کرنے والوں کا ظاہر ان کے باطن کی طرح تاریک ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب

---

[1] ''گلشن راز جدید'' کا آخری حصّہ 'بندگی نامہ' کے عنوان سے ہے جو زبورِ عجم کا اختتامیہ حصّہ ہے

نے علاّمہ کے اسی پیغام کو ان کے ہی شعر کے ذریعے قارئین تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

''بندگی نامہ'' کے آخری بند میں علاّمہ اقبالؔ نے بجا طور پر قارئین کتاب کو عشق و محبت کا پیغام دیا ہے۔

عشق مور و مرغ و آدم را بس است
دعشق تنہا ہر دو عالم را بس است
دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است
ہر دو را درکار ہا آمیخت عشق !
عالمے در عالمے انگیخت عشق !

پروفیسر چشتی صاحب نے اس بند کی تشریح کرتے ہوئے اس

پیغام کو علاّمہ کے پیغام کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے' لکھتے ہیں:۔

'اگر ایک مسلمان مسلکِ عشق اختیار کر لے تو اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ وہ دلبری اور قاہری دونوں بیک وقت اپنی ذات میں جمع کر لے گا۔ اور جب کسی انسان کی ذات میں دلبری اور قاہری دونوں کا اجتماع ہو جائے گا تو وہ اس دنیا میں ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے۔ یعنی وہ اس دنیا میں جو کفر سے معمور ہے قرآنی نظام کو نافذ کر سکے گا۔ اور جب قرآنی نظام نافذ ہو جائے گا تو بلاشبہ نئی دنیا معرضِ وجود میں آجائے گی۔ ایسی دنیا جس میں کوئی شخص کسی کا محتاج نہیں ہوگا۔''[1]

پروفیسر چشتی صاحب کی شرحیں اقبالؔ کی شخصیت اور ان کے تخلیقی شعور کو بہت حد تک واضح کرتی ہیں۔ اقبالؔ کے شارحین میں چشتی صاحب کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور دنیائے ادب میں وہ شارحِ اقبالؔ کی حیثیت سے ہی معرف ہوئے ہیں۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی زبورِ عجم مع شرح۔ ص ۔ 622